سو سوال (100)

پروفیسر ڈاکٹر
علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی
(ستارۂ امتیاز)

سو سوال (۱۰۰)

(سیٹ)

یکے از تصنیفات

پروفیسر ڈاکٹر

علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی

ڈاکٹر آف لیٹرز (آنریری) ڈسٹنگوشڈ سینیئر پروفیسر، سینیئر یونیورسٹی کینیڈا۔ یو ایس۔ اے

شائع کردہ:

دانشگاہِ خانۂ حکمت

ادارۂ عارف

3 اے نور ویلا۔ گارڈن ویسٹ کراچی 3 پاکستان

www.monoreality.org

تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (۱۶ : ۸۹)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی مَنِّہٖ وَ اِحْسَانِہٖ خداوندِ ربّ العزّت کی بے پایان رحمتوں اور کرامتوں سے کتاب "سو سوال" ۱۹۷۸ئہ کی اشاعتِ اوّل سے اس وقت تک مقبول سے مقبول تر ہوتی آئی ہے اور اس میں قرآنی تاویلات اور حکمتوں کی روشنی میں مشکل سوالات کے جو جوابات دیئے گئے ہیں ان سے مومنین و مومنات کے علمی عقدے حل ہو گئے ہیں۔

سوال و جواب کی صورت میں تعلیمِ قرآنِ کریم کا ایک اساسی قانون رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ"

یعنی پوچھو اہلِ ذکر (یعنی ائمۂ طاہرین) سے جو کچھ تم نہیں جانتے (۱۶ : ۴۳)۔

اور اسی قانون کے مطابق صاحبِ سلونی مولانا علی علیہ السلام فرماتے تھے، "سلونی قبل ان تفقدونی" یعنی پوچھو تم مجھ سے قبل اس کے کہ تم مجھے کھو دو گے۔

سوال ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کے "تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ" کی حیثیت میں نازل ہونے کے باوجود ائمۂ طاہرین سے پوچھنے کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ اس کا جواب خود قرآنِ کریم کی کئی آیات میں حکیمانہ طور پر دیا گیا ہے۔ منجملہ قرآن میں آیات

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

(۲ : ۱۲۹، ۱۵۱ ؛ ۳ : ۱۶۴ ؛ ۶۲ : ۲) پیغمبر کو قرآن اور اس کی حکمت کا مُعَلِّم قرار دیا گیا ہے اور آیت (۱۶ : ۴۴) میں خداوندِ ربّ العزّت فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ قرآن کے مُبَیِّن یعنی بیان کرنے والے ہیں۔ یہی مضمون آیت (۵ : ۱۵) سے بھی ظاہر ہے کہ خدا نے لوگوں کی ہدایت کے لئے صرف کتاب نہیں بلکہ اس کا سماوی مُعَلِّم و مُبَیِّن بھی بہ صورتِ نور بھیجا ہے۔

آیۂ قَدْ جَاءَكُمْ کو پڑھ لیا کر جانِ من!
(۵ : ۱۵)
نورِ حق کی روشنی میں سب کو رہبر ہے کتاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسی قانون کے مطابق اپنے بعد دو بھاری چیزیں یعنی کتابِ خدا اور عترت چھوڑیں اور ان کو مضبوطی سے پکڑنے کے لئے تاکید فرمائی اور فرمایا کہ یہ دونوں گران قدر چیزیں حوضِ کوثر تک ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوں گی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اسماعیلی مذہب میں علم و حکمت اور رشد و ہدایت کے یہ دو عظیم ترین سماوی وسائل حاضر و موجود ہیں۔ اس لئے یہاں پر کوئی ایسا سوال پیدا ہو ہی نہیں سکتا جس کا جوابِ باصواب نہایت آسانی کے ساتھ میسر نہ ہو۔ "سو سوال" کی اس کتاب میں بظاہر سو اور درحقیقت ہزاروں سوالوں کے باصواب جوابات ان سماوی وسائل سے حاصل کردہ علم و حکمت کی روشنی میں موجود ہیں اور ہمیں یقینِ کامل ہے کہ اس کتاب سے مومنین و مومنات کے لئے جو بھی مسائل پیدا ہوں گے، ان کے جوابات نہایت آسانی کے ساتھ حل ہوں گے۔ ان شاء اللہ۔

انتساب : ۱

کتاب سو سوال کا یہ حصہ ادارۂ عارف کے صدر اور انچارج انٹرنیشنل

کیسٹ سیکشن اور ILG محمد عبد العزیز، اور ان کی زوجہ محترمہ یاسمین محمد، ریکارڈ آفیسر اٹلانٹا ہیڈ کوارٹر، انچارج ہائی ایجوکیٹر اور ILG کے قابلِ قدر والدین کے نام ہے۔

جناب محمد عبد العزیز کی والدۂ محترمہ کا نام شیرین خانم بنتِ شکور تھا، شیرین صاحبہ ایک دیندار اور خدمت کی دلدادہ خاتون تھیں، انہوں نے تقریباً ۳۰ سال تک لیڈیز والنیٹر تنظیم میں خدمات انجام دیں اور کئی میڈلز بھی حاصل کیے جبکہ آپ کے والد محترم حضور موکھی عبد العزیز ابنِ قاسم بڑے مذہبی اور خدا پرست انسان تھے، انہوں نے والنیٹر کی حیثیت سے نیز کسی مجلس کے موکھی کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دینے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔

محترمہ یاسمین صاحبہ کی والدۂ محترمہ شیرین حبیب املانی کو مذہبی امور اور جماعت کی خدمت سے بہت ہی دلچسپی تھی، ان کو کھارادر جماعت خانے میں ۱۵ سال تک والنیٹر کیپٹن رہنے کے علاوہ تین سال تک بیت الخیال کی موکھیانی کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دینے کا شرف حاصل ہے، جبکہ آپ کے والد محترم جناب حبیب املانی ایک سادہ لوح اور با اخلاق مومن تھے، ان کو بچپن ہی سے مذہب سے لگاؤ تھا دعا و گنان پڑھنے سے بھی بہت دلچسپی تھی۔

انتساب ۲:

محترمہ شاہ بی بی جنت علی حسینی (برانچ) آئی ایل جی، دانشگاہ خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف سے گذشتہ ۲۴ سالوں سے وابستہ ہیں، آپ کی طبیعت میں دستِ قدرت نے سنجیدگی، عالی ظرفی، اخلاص، یقین اور محبت کے جو عناصر گوندھے ہیں، ان کی ایک واضح جھلک آپ کے اخلاق و اعمال میں نظر آتی

ہے، آپ کی پُرخلوص و فداکارانہ خدمات ادارے کی تاریخ میں تابان و درخشان رہیں گی۔

یہ دسترخوانِ علمی آپ کے خاندان کے مرحُومین (محترمہ زینب گُل مُحمّد، محترمہ نُور بانو حسن علی، زینب حسن علی اور نفیسہ حسن علی) کے حق میں تشنگانِ علم کے لئے آپ کے تعاون سے بچھایا گیا ہے۔

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سو سوال (۱۰۰)

حصّهٔ اوّل

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

This Page Intentionally Left Blank

فہرستِ عنواناتِ "سو سوال" حِصّۂ اوّل

سوال نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
-	ابتدائیہ	۵
۱	عِلم کا خاتمہ	۸
۲	رجعتِ رُوح	۱۰
۳	قرآن وحدیث	۱۲
۴	اولوالامر	۱۳
۵	مذہب اور سائنس	۱۴
۶	سورۂ یاسین	۱۵
۷	لاابتداء اور ابتداء	۱۶
۸	امامِ مستودع	۱۹
۹	قبر اور قیامت	۲۱
۱۰	حاضر امام کا درجہ	۲۳
۱۱	خُدا تعالیٰ	۲۵
۱۲	نُورٌ علیٰ نُور	۲۸
۱۳	صلوات	۲۹
۱۴	ذکر و بندگی	۳۰
۱۵	حضرتِ عیسیٰؑ اور حضرتِ محمّدؐ	۳۱

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سوال نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
۱۶	نُور کہاں سے آیا؟	۳۳
۱۷	جِن	۳۵
۱۸	اُڑن طشتریاں	۳۶
۱۹	قیامت	۳۸
۲۰	دُنیا میں کیوں آ گئے	۳۹
۲۱	بہشت اور دوزخ	۴۰
۲۲	نظامِ ہدایت	۴۲
۲۳	طریقِ عبادت	۴۵
۲۴	بچّوں کی پیدائش کا مسئلہ	۴۵
۲۵	حضرتِ عیسیٰؑ	۴۶

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

ابتدائیہ

میرے پروردگار! تیرے بزرگ نام اور تیرے پاک ذکر کے روشن معجزات اور عظیم احسانات سے قربان ہو جاؤں، اے خُداوندِ برحق! اے احکم الحاکمین! تیری قدرت و رحمت کے ظہورات کس قدر عجائبات و غرائبات سے بھرپور ہیں، تیری مدد اور دستگیری کمزوروں اور بے سہاروں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے، اور تیری توفیق و یاری ناتوانوں میں کس طرح کام کر دیتی ہے۔

الحمدُ للہ کہ خانۂ حکمت کے معزز ارکان اپنے مُقدّس ادارے کی خدمات اور ترقی سے جو ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء کے چند مہینوں میں نصیب ہُوئی ہے، بہت ہی خُوش و خرسند اور مطمئن ہیں، وہ اپنے خُداوندِ قدّوس کی بے پناہ رحمتوں اور مہربانیوں کے نتیجے میں قلبی طور پر شکرگُزار ہونا چاہتے ہیں، کہ اس قلیل عرصے میں جتنی علمی خدمت انجام دی گئی ہے، وہ کافی مؤثر، بہت ہی مُفید، بڑی نتیجہ خیز، نہایت دُوررس اور انتہائی ہمہ گیر خدمت ہے۔

چُنانچہ "سو سوال" کی کتاب جو چار حِصّوں پر مشتمل ہے اسی خدمت کے سِلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں سو سوالات سے بحث کی گئی ہے اور ان کے مدلّل جوابات دیئے گئے ہیں، اور اِس کتاب کی تصنیف کا سبب یُوں ہے کہ گزشتہ سال (۱۹۷۷ء میں) ہز ہائی نس دی آغا خان شیعہ امامی اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے کینیڈا کی "ایسٹرن کینیڈا ریجنل کمیٹی" نے مجھے وہاں کی نیکنام جماعت میں دورہ

کے لئے مدعو کیا تھا، یہ دعوت نامہ جانِ عزیز جناب ڈاکٹر فقیر محمّد صاحب ہونزائی کے توسط سے بھی اور آنریری سیکریٹری جناب ڈاکٹر شیراز اسماعیل صاحب کے ذریعے سے بھی موصول ہُوا تھا، چُنانچہ میں اس مبارک دعوت کے بموجب مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۷۷ئہ کو کینیڈا کے عظیم ملک میں پہنچ گیا، اور وہاں خُداوندِ برحق کے فضل وکرم سے اس بندۂ محتاج کو مذہبی، علمی اور رُوحانی خدمات کے لئے جو بہترین موقع ملا، وہ ہمیشہ ہمیشہ شکر گزاری اور قدر دانی کے ساتھ یاد رہے گا۔

اِس علمی خدمت کے دَورہ کے دَوران لیکچروں، سیمناروں اور چھوٹے بڑے مباحثوں میں جو جو سوالات کئے گئے وہ سب ملاکر ایک ہزار کے قریب تھے، جن کے جوابات بروقت دیئے گئے، مگر اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ ان میں سے چیدہ چیدہ سوالات کے جوابات کو کتابی شکل میں پیش کیا جائے، چُنانچہ اِس منشاء کے مطابق پچیس ۲۵ پچیس ۲۵ کے چار حِصّوں پر مشتمل "سو سوال" کی کتاب مکمّل کی گئی ہے، اور اِنشاء اللہ تعالیٰ اس کے حِصّے ترتیب وار شائع ہو رہے ہیں۔

مَیں مشرقی کینیڈا کی مذکورہ ریجنل کمیٹی اور پُوری جماعت کا شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے مجھے نہ صرف ایسی نایاب جماعتی خدمت کے لئے موقع فراہم کر دیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے مجُھ سے خاطر خواہ تعاون بھی کیا، میں ان کے تمام عملداروں کی حلیمی، صداقت اور شفقت کو فراموش نہ کرسکوں گا۔

مجھے اُس عزیز اور نیکنام جماعت کے تمام افراد کے حق میں ہمیشہ جان و دل سے دُعاگو رہنا چاہیئے، جنہوں نے مذہب اور عِلم کی باتوں کے لئے زیادہ سے زیادہ اعتماد کے ساتھ میری طرف توجّہ دی، اور خصوصی دُعائیں نہ صرف میری بلکہ پُوری جماعت کی بھی اُن بابرکت گھروں کو حاصل ہوں، جن کی اعلیٰ سے

اعلیٰ رہائشی اور دفتری سہولتوں اور بے مثال خدمات کے بغیر میرا اور جانِ عزیز کا کوئی علمی کام مکمّل نہیں ہو سکتا تھا، کاش کہ مَیں پوری پوری ترجمانی کر سکتا کہ اُن گھروں کے افراد کِس کِس درجے کے دیندار اور امامِ برحقؑ کے کیسے جانثار ہیں اور ان کا ایمان کِس قدر کامل اور مکمّل ہے۔

اِس موقع پر جانِ عزیز جناب فقیر مُحمّد صاحب ہونزائی کے ذکرِ جمیل کے بغیر مقصد کی باتیں مکمّل نہیں ہو سکتی ہیں، میرے دوستوں اور عزیزوں کی اکثریت کو اِس حقیقت کی خبر ہے کہ مَیں صاحبِ موصوف کو اپنے لئے فرشتۂ رحمت سمجھتا ہُوں، جس کی اگر ایک دو وجہیں ہوتیں تو فوراً ہی بتا دیتا وہ تو بہت ہی زیادہ ہیں، آپ ہی کی وجہ سے میرے مغرب کا سفر آسان اور کامیاب ہُوا، اور آپ ہی نے شمالی امریکا جیسے ترقی یافتہ مُلک میں میرے دَورے کو ممکن بنا دیا، اور پھر عرض کرتا ہُوں کہ ان کے احسانات مجُھ پر بہت زیادہ ہیں۔

اِس تمہید کے اختتام پر ہماری یہ عاجزانہ دُعا ہے کہ پروردگارِ عالم جملہ جماعت کو علم و عمل کے میدان میں آگے سے آگے بڑھنے اور دین و دُنیا کے نیک کاموں میں ترقّی کرنے کی اعلیٰ توفیق و ہمّت عنایت فرمائے! آمین یارب العٰلمین!!

فقط جماعت کا ایک علمی خادم
علّامہ نصیرُ الدّین نصیرؔ ہونزائی
مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

علم کا خاتمہ :-

سوال ۔ ۱ : آپ نے اپنے لیکچر کے دوران فرمایا تھا کہ علم ایک مقام پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، یہ کس طرح ممکن ہے؟

جواب : قرآنِ پاک ۱۶/۷۰ اور ۲۲/۵ کو غور و فکر سے پڑھو تو معلوم ہو جائے گا کہ بندۂ مومن عالمِ رُوحانی میں علمی بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ کر ناکارہ ہو جاتا ہے، یعنی وہ اُس وقت علم کے بے پناہ سمندر سے گزر کر ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں اس کے سامنے جاننے کے لئے یعنی جدید علمی تجزیہ و تحلیل کے لئے کچھ بھی نہیں بچتا، کیونکہ اُس نے اپنی رُوحانی عمر کے لمبے عرصے میں سب کچھ جان لیا ہے، لہٰذا اب اس کے نزدیک علم جو ایک عقلی اور فکری سفر تھا تمام اور ختم ہو چکا ہے۔

اِس سلسلے میں دُوسرا نکتہ یہ ہے کہ ذاتِ خُدا کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ ہلاک یعنی ختم ہو جاتا ہے (۲۸/۸۸)۔ یہاں پر یہ حقیقت صاف ظاہر ہے کہ علم بھی ختم ہو جاتا ہے، لیکن یہ بات الگ ہے کہ خُدا تعالیٰ ہر چیز کو بار بار پیدا کر دیتا ہے، جیسے دن اور رات دُوسری تمام چیزوں کی طرح ختم تو ہو جاتے ہیں، مگر خُدا ان کو بار بار پیدا کرتا ہے، جس کی وجہ سے دن رات اور زمانے کا سِلسلہ لا انتہا ہو جاتا ہے۔

علم چیزوں کو جاننے کا نام ہے، سو جب تک کائنات قائم ہے تب تک چیزیں باقی اور علم کا سلسلہ جاری ہے، جب آیۂ مذکورہ بالا کے مطابق کائنات ختم ہوئی اور کوئی چیز باقی نہ رہی تو وہ علم بھی نہ رہے گا جو چیزوں کے تجزیہ و تحلیل کرنے سے حاصل ہوتا رہتا تھا، کیونکہ علم صفت ہے عالم کی جو اُس عالم یعنی کائنات کو جاننے سے حاصل ہوتا ہے، ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ علم، عالم (کائنات) اور عالِم بار بار ختم ہو جاتا ہے اور بار بار پیدا ہو جاتا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر بار کے اعتبار سے علم ختم ہونے والا ہے اور بار بار کے سلسلے کے لحاظ سے کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

قرآن کی سورت ۱۳ آیت ۸ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہر چیز خُدا تعالیٰ کے نزدیک ایک خاص مقدار میں ہے، اس کا اشارہ یہ ہے کہ اگرچہ فی الحال انسان کو بعض چیزیں لاعلمی کی وجہ سے غیر محدود جیسی لگتی ہیں، لیکن جب وہ رُوحانیت کی بلندیوں پر پہنچ کر نورِ الٰہی کی روشنی میں دیکھنے لگے گا، تو اُس وقت عین الیقین سے مشاہدہ کرے گا اور حقیقتِ حال اُس پر ظاہر ہو جائے گی کہ ظاہری اور باطنی چیزیں سب کی سب ایک مخصوص مقدار میں محدُود ہیں (۱۳/۸) اور اسی طرح کائنات کی عُمر بھی محدُود ہے اور علمی علم بھی، جس کا دار و مدار اس ظاہری دُنیا پر ہے (۱۱/۱۰۷) یہ تشریح ہے ہر چیز کے فنا ہو جانے کی، اور مکان کی مُدّتِ عمر یعنی دُنیا کی بقا کا وقت ختم ہو جانے کی۔

خوب جاننا چاہئے کہ حقیقت کے جس پہلو سے خُدا کی چیزیں کبھی ختم نہیں ہوتی ہیں وہ یہ ہے کہ ختم ہو جانے کے باوجود مسلسل یا وقفہ وقفہ کے بعد دوبارہ پیدا کی جاتی ہیں، جیسے موسمِ گرما و سرما کا آپس میں بدل بدل کر بار بار آنا وغیرہ۔

رجعتِ رُوح :-

سوال ۲ : آپ نے سیمینار (SEMINAR) میں کہا کہ رُوح دُنیا میں بار بار آتی رہتی ہے، ناکامی کے طور پر بھی اور کامیابی کی صورت میں بھی اور کامیابی کے بعد انسان اِس دُنیا میں اس لئے آتا ہے کہ آٹھویں جنّت کے آخری مرحلے پر جانے کے بعد علمی نعمتوں کا سِلسلہ اپنی انتہا کو پہنچتا ہے، لہٰذا بندۂ مومن علم و عمل کی تجدید کی خاطر دُنیا کی طرف رجوع کرتا ہے، لیکن ہمارا سوال ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جنّت کی ابدی نجات اور دائمی راحت جو خُدا تعالیٰ کی طرف سے مومن کو حاصل ہوئی ہے، وہ پھر ایک وقت کے بعد ختم ہو، اور رُوحِ مومن اس کی تلاش میں دوبارہ دُنیا میں آئے؟

جواب : دراصل یہ سوال بھی وہی ہے جس کا جواب اُوپر دیا گیا ہے، تاہم مزید وضاحت کی جاتی ہے، کہ جب انسان معرفت کے درجۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے تو اُس کو اس حقیقت کا پُورا پُورا یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کی "انا" یعنی خودی دو درجوں میں ہے وہ درجۂ اعلیٰ پر یک حقیقت (MONOREALISM) ہے اور درجۂ ادنیٰ پر انسان، وہ سُورج کی طرح ہمیشہ ایک حال پر قائم بھی ہے اور چاند کی طرح گھٹتے بڑھتے ہوتے بار بار آتا جاتا بھی ہے، کیونکہ حکمت اور خیرِ کثیر کا تقاضا یہی ہے۔

سورۂ یاسین کی آیت ۶۸ میں جیسے فرمایا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کو رُوحانی عالم میں بڑی سے بڑی عمر دی جاتی ہے اس کو اس دُنیا میں کسی بڑے کارنامے کے لئے بھیجا جاتا ہے، آیۂ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے:-

اور جس کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں اس کو (عالمِ امر سے عالمِ)
خلق میں سرنگون کر دیتے ہیں، کیا وہ نہیں جانتے ہیں

(۳۶/۶۸)

جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ جس عمر کو لمبی عمر قرار دیتا ہے وہ خُدا ہی کے معیار کے مطابق لمبی ہے لہٰذا وہ اِس دُنیا کے حساب سے بے پناہ ہے اور لفظ "سرنگون" کی حکمت یہ ہے کہ مثال کے طور پر عالمِ امر (روحانی عالم) اور عالمِ خلق (جسمانی عالم) ایک دوسرے سے مل کر ایک مکمل دائرے کا تصور پیش کرتے ہیں، جس میں اُوپر کا نصف دائرہ عالمِ امر ہے اور نچلا نصف دائرہ عالمِ خلق، اس مثال میں جو شخص عالمِ ظاہر سے عالمِ باطن کی انتہائی بلندی تک جائے اس کا سر اُوپر کی طرف ہوگا، اور جب وہ وہاں سے دُنیا کی طرف آئے تو وہ سرنگون (UPSIDE-DOWN = اوندھا) ہو کر آتا ہے۔

حضرتِ آدم علیہ السلام اِس دُنیا میں کہاں سے وارد ہوئے؟ کہاں سے تشریف لائے؟ عالمِ امر سے، عالمِ رُوحانی سے، بہشت سے، کس درجے کی بہشت سے؟ آخری درجے کی بہشت سے، کیا اِس ہبوط (DESCENDING) میں حضرتِ آدم تنہا تھے یا ان کے ساتھ اور بھی افراد تھے؟ ان کے ساتھ بی بی حوّا کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ تھے، کیا یہ درست ہے کہ آدم و حوّا اور ان کے ساتھیوں کی عمریں جنت میں اس حد تک پہنچ گئی تھیں

کہ ان کو دُنیا میں آنا ضروری ہو گیا تھا؟ ہاں یہ بات بالکل حقیقت ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی سُنّت و عادت اور قانُونِ فطرت ہمیشہ ایک ہی ہے اور اُس میں کوئی تبدیلی نہیں تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آدم اور ان کے بہت سے ساتھیوں کی طرح کامل رُوحیں عالمِ بالا سے اِس دُنیا کی طرف آتی رہتی ہیں؟
جی ہاں، یہ صحیح ہے۔

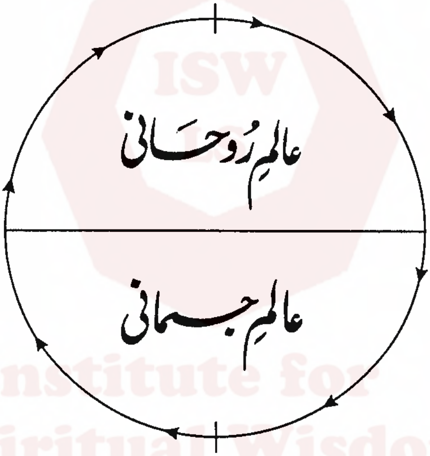

وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰)
اور ہر چیز ایک دائرے میں گردش کرتی رہتی ہے۔

قرآن و حدیث :-

سوال ۳ : قرآن و حدیث کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ کیا یہ درست ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ:
اگر مُسلمان دس فیصد حدیثوں کو نظر انداز کریں تو وہ (دینی طور پر) ہلاک

ہو جائیں گے، اور ایک وقت آنے والا ہے کہ جس میں دس فیصد سے زیادہ حدیثوں پر عمل نہیں کیا جائے گا؟

جواب : قرآن و حدیث کا رشتہ یہ ہے کہ حدیث قرآن کی وضاحت و تشریح ہے کیونکہ وہ معلّمِ قرآن کا قول ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ حدیث صحیح ہو، موضوع نہ ہو، یعنی ایسی نہ ہو کہ وہ لوگوں نے اپنی غرض کے لئے بنائی ہے، تو اس صورت میں جبکہ حدیث صحیح ہے قرآن کے بعد دین میں اسی کو اہمیّت حاصل ہوگی، کیونکہ خُدا کے کلام کے بعد رسُولؐ کا کلام قابلِ تعظیم اور واجب العمل ہے، لیکن یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ حدیثِ ثقلین کے ارشاد کے بعد مُسلمانوں کو صرف حدیثوں پر چھوڑ دیا جائے، جبکہ آنحضرتؐ اس بات کو اچھی طرح سے جانتے تھے کہ لوگوں کے لئے یہ امر انتہائی مشکل ہے کہ وہ صحیح حدیث اور غیر صحیح کے درمیان فرق و امتیاز کریں، نیز اس میں بھی بڑا تعجب ہوگا کہ حدیثیں جن کا زیادہ سے زیادہ تعلق زمانۂ رسُولؐ سے ہے جدید مسائل کو حل کر سکتی ہیں۔

ہمارے نزدیک خُدا و رسُولؐ اور اولوا الامر کی اطاعت کے یہ معنی ہیں کہ امامِ زمان علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر برحقؐ کا نمائندہ اور خلیفہ مانیں، اس کے امر و فرمان کی روشنی میں قرآن و حدیث کے ظاہر و باطن کو سمجھیں اور عمل میں لائیں، اسی میں خدائے پاک اور پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خوشنودی ہے۔

اولوا الامر :-

سوال ۴ : دُوسرے مُسلمان "اولوا الامر منکم" سے کیا مُراد لیتے

ہیں یا کس حد تک اس اصُول کو قبول کرتے ہیں ؟

جواب : گروہِ امامیہ کے سوا جو بھی ہیں وہ البتہ حکمرانوں کو اولوالامر مانتے ہیں، حالانکہ یہ نظریہ درست نہیں، کیونکہ اولوالامر سوائے أئمّۂ کرام علیہم السّلام کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ امرِ خُداوندی کے مالک ہونے کے لئے اعلیٰ ترین اوصاف چاہئیں، اور سب سے پہلے یہ کہ وہ خُدا اور رسُولؐ کی جانب سے مقرّر ہوں تاکہ نورِ ہدایت کے حامل ہو سکیں، وہ محمّد و علی صلوات اللہ علیہما کے توسّط سے آلِ ابراہیمؑ ہوں، ان کا سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چلا آیا ہو، تاکہ معلوم ہو کہ خُدائی نُور کا معجزہ انہیں کے ساتھ ہے، ایسے ہی سلسلے کے حضرات یقیناً اولوالامر ہیں یعنی أئمّۂ طاہرین علیہم السّلام۔

اِس اصول کے برعکس اگر مانا جائے کہ حاکمِ وقت اولوالامر کے مرتبہ پر ہے تو اِس عقیدہ سے اسلام کے اندر بیک وقت بہت سے ایسے اولوالامر پائے جائیں گے جو ایک دُوسرے کے خلاف ہیں جو بعض دفعہ ایک دُوسرے سے جنگ کرتے ہیں، اور وہ جنگ اسلام کی خاطر نہیں ہوتی بلکہ وہ ذاتی یا مُلکی مفاد کے لئے ہوتی ہے، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص خُدا اور پیغمبرؐ کا جانشین اور ولیٔ امر ہو جو اسلامی اور اخلاقی قانون کے بغیر مُسلمانوں کا خُون بہاتا ہے۔

مذہب اور سائنس :-

سوال ۵ : مذہب اور سائنس کے آپس میں کیا رشتہ ہے؟

جواب : جاننا چاہئے کہ جو مذہب صحیح ہے وہ حقیقی اسلام ہے

اور جو سائنس غلط نہ ہو بالکل درست ہو وہ قانونِ فطرت ہے، اور اہلِ دانش جانتے ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے یعنی یہ قانونِ قدرت کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہے، جس کا مطلب یہ ہُوا کہ حقیقی اسلام اور درست و مکمل سائنس ایک ہی چیز ہے، جیسے ایک ندّی کبھی دو شاخوں میں بٹ کر بہتی ہے اور کبھی مل کر بہتی ہے اور وہ ہر حالت میں ایک ہی ہے۔

اس وضاحت کا خلاصہ یہ ہے کہ اَب وقت قریب آچکا ہے کہ سائنس اور مذہب آپس میں کُلّی طور پر مل جائیں، جس کے نتائج سے دُنیا کے بہت سے لوگوں پر قیامت گزرے گی، وہ یہ کہ دین شناسی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اُس وقت مایوس ہو جائیں گے، کیونکہ حدیثِ شریف میں فرمایا گیا ہے کہ یقیناً اسلام عجیب و غریب طرح سے شروع ہُوا ہے اور آخر میں بھی یہ اسی طرح عجیب و غریب ہو جائے گا۔

(صحیح مُسلم جلد اوّل، باب ۶۲، حدیث نمبر ۲۸۱)

سورۂ یاسین :-

سوال ۶ : سورۂ یاسین کے معنی اور تاویل کیا ہیں؟

جواب : میرے عزیز! میں سمجھتا ہوں کہ تُم نے جو کچھ پُوچھنا چاہا ہے وہ در اصل مختصر ہے، مگر یہاں جس طرح لکھا ہے وہ بہت ہی طویل بحث ہے، یعنی مسئلہ صرف "یاسین" کے نام ہی کا تھا لیکن تُم نے پُورے سورۂ یاسین کو سوال کی صُورت میں پیش کیا ہے، بہرحال میں یاسین (یٰسٓ) ہی کے اسم کا جواب دوں گا جو حروفِ مقطعات میں سے ہے، اور وہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام

میں یہ حقیقت کسی اختلاف کے بغیر مسلّمہ ہے کہ یاسین آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مبارک القابات میں سے ہے، جیسے "طٰہٰ" کی مثال ہے کہ یہ بھی آنحضرتؐ کے وصفی ناموں میں سے ہے۔

چنانچہ حرف "ی" کا عدد ۱۰ ہے، جو ناطق یعنی حضرت محمّد رسول اللہ کے لئے مقرّر ہے، جیسے: ایک مستجیب کے لئے ہے، ۲ ماذونِ اصغر، ۳ ماذونِ اکبر، ۴ داعیِ مکفوف، ۵ داعیِ مطلق، ۶ حجّتِ جزیرہ، ۷ حجّتِ مقرّب، ۸ امامِ زمانؑ، ۹ اساسؑ (علیؑ)، اور ۱۰ ناطق یعنی رسُولِ مُصطفٰےؐ کے لئے ہے، جیسے قرآن کا ارشاد ہے کہ:

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ (۲/۱۹۶) یہ دس مکمّل ہے، یعنی دس حدودِ جسمانی کی آخری حد ہے جو ناطقؐ ہے۔

دُوسری طرف سے حرف "س" کو لیں جس کا عدد ۶۰ ہے، جس میں پہلا دس حضرتِ آدمؑ کے لئے ہے، دوسرا دس حضرتِ نوحؑ کے لئے، پھر حضرتِ ابراہیمؑ، حضرتِ موسیٰؑ، حضرتِ عیسیٰؑ اور حضرتِ محمّدؐ کے لئے دس دس ہیں، اس کی تاویل یہ ہوئی کہ حرفِ "ی" کے لحاظ سے آنحضرتؐ چھوٹے دَور کے مراتب میں مرتبۂ دہم پر ہیں اور بڑے دَور کے اعتبار سے مرتبۂ ششم پر۔

لا ابتداء اور ابتداء:-

سوال ۷: کہتے ہیں کہ ہم حضرتِ آدمؑ اور حوّا سے ہیں، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم پہلے پتھر، نباتات وغیرہ تھے، ان میں سے کون سا نظریہ صحیح ہے؟

جواب : دونوں باتیں درست ہیں کیونکہ ہم آدمؑ و حوّا سے ہیں اور وہ مٹّی وغیرہ سے ہیں، یا یوں کہنا چاہیئے کہ ہم آدمؑ اور حوّا کی نسل ہونے کے علاوہ جسم کی تکمیل کے لحاظ سے جمادات، نباتات اور حیوانات سے بھی ہیں، کیونکہ ہمارے والدین کی اور ہماری غذائیں انہی چیزوں سے تیار ہوتی ہیں، جن سے ہمارا جسم بنتا ہے۔

اگر اس سوال میں ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہو، تو وہ نظریّہ میرے نزدیک درست نہیں، کیونکہ اس کے پس منظر میں لادینیت کا تصوّر موجود ہے، یعنی اس میں خُدا کی ہستی سے انکار اور اس کی قدرت کی نفی کرنے کے لئے کوشش کی گئی ہے، جبکہ مانا گیا ہے کہ کائنات اپنے آپ ایک حادثہ کے نتیجے پر پیدا ہُوئی ہے، اور انسان بھی خود بخود ایک چیز سے دُوسری چیز میں بدلتا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ بندر کی شکل میں تبدیل ہوگیا، اور پھر رفتہ رفتہ وہ اِنسان بن گیا۔

ڈاروِن سے ہماری کوئی دُشمنی نہیں، مگر افسوس ہے کہ اُس نے عالمِ مافوق الفطرت اور اس کے بادشاہ کے بارے میں ذرا بھی نہیں سوچا اور آنکھیں بند کرکے صرف فطرت ہی کے سمندر میں چھلانگ لگائی اور اسی میں ڈوبتا گیا، اگر وہ اس سرحد سے آگے نکل جاتا جہاں سے اس کا نظریہ شروع ہوجاتا ہے تو شاید وہ اِس حقیقت کے سمجھنے میں کامیاب ہوجاتا کہ کسی ابتدا اور انتہا کے بغیر ہمیشہ سے ایک بہت ہی عظیم زندہ طاقت موجُود ہے، جس کی کارفرمائی کے بغیر کسی چیز سے کوئی حرکت اور کوئی کام نہیں ہوسکتا ہے۔

بُنیادی سوال دراصل یہ ہونا چاہیئے کہ آیا ہم وجود و عدم دونوں کو مانتے ہیں یا نہیں؟ اگر مانتے ہیں، تو یہ بھی پُوچھنا ہوگا کہ وجود و عدم یا کہ ہستی اور نیستی پر

خدا تعالیٰ کی بادشاہی اور حکمرانی ہے یا نہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے تو پھر یہ پُوچھنا چاہیئے کہ خالقِ ارض و سمانے وجود کو تو عدم سے بنایا اور عدم کو کس چیز سے بنایا تھا؟ یہ سوال اتنا مشکل ہے کہ دُنیا اس کا جواب نہیں دے سکتی ہے، مگر اہلِ تائید کے پاس اس کا صحیح جواب موجود ہے وہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہستی کو نیستی سے پیدا کیا اسی طرح اُس قدرت والے نے نیستی کو ہستی سے بنائی، چُنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی چیزیں ہونے کے بعد نہیں ہوتی ہیں اور بہت سی چیزیں نہ ہونے کے بعد ہو جاتی ہیں۔

اِس سے کسی شک کے بغیر یہ حقیقت روشن ہُوئی کہ جس طرح دن سے رات اور رات سے دن پیدا ہونے کا سلسلہ جاری ہے اسی طرح ہستی سے نیستی اور نیستی سے ہستی پیدا ہو جانے کا سلسلۂ لا متناہی چلتا رہتا ہے، اور یہ نظریہ قرآنی حکمت ہی کا ہے نہ کہ کسی اور کا۔

جاننا چاہیئے کہ خُدا کی بادشاہی میں عدمِ محض محال ہے یعنی ایسی نیستی ناممکن ہے جس کی کیفیّت کچھ بھی نہ ہو، بلکہ یہ عدم مجازی ہے اور اس کی روشن ترین شہادت قرآن ہی سے مل سکتی ہے کہ اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

(وہ ہر صفت سے)، پاک صاف ہے جس نے زمین سے اُگنے والی چیزوں اور خود اُن لوگوں کے اور اُن چیزوں کے جن کا انہیں علم نہیں سب کے جوڑے پیدا کیئے (۳۶/۳۶) مقصد یہ ہے کہ کوئی چیز جوڑے کے بغیر نہیں، خواہ وہ نباتات میں سے ہو یا کوئی جانور اور اِنسان، یا کوئی ایسی چیز جس کا تعلق عقل اور علم سے ہے، پھر اِس سے صاف صاف ظاہر ہے کہ ہستی اور نیستی بھی ان جوڑوں میں سے ہیں جن کو خُدا نے بنایا ہے، جس کے معنی یہ ہُوئے کہ جس طرح خُدا نے ہستی کو نیستی سے ظاہر کیا ہے اسی طرح اُس نے نیستی کو ہستی

سے اخذ کر کے پوشیدہ رکھا ہے، اور دونوں میں سے کوئی ایک آگے اور ایک پیچھے ہرگز نہیں، بلکہ کسی تقدیم و تاخیر کے بغیر یہ دونوں دائرۂ لاابتدا پر واقع ہیں تاہم اگر آپ چاہیں تو اس واقعۂ لاابتدا کو کسی مصلحت کے تحت ابتداء کے طور پر پیش کر سکتے ہیں وہ یہ کہ ہمیشہ یہ کہتے رہیں کہ خُداوند تعالیٰ نے ہستی کو نیستی سے پیدا کیا، پھر نیستی پر علم و حکمت کی روشنی نہ ڈالنا، اس کی حقیقت سے پردہ اُٹھانے کی کوشش نہ کرنا، خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (۶۷/۲) (اُس نے موت اور حیات کو پیدا کیا) کی تحقیق نہیں کرنا کہ خُدا نے حیات کو تو مخلوق کیا اور موت کو کس طرح مخلوق کیا؟ کیا ہماری یہ جُزوی حیات و ممات اِس عظیم کائنات کی بقا و فنا کی دلیل ہو سکتی ہے؟ یعنی کیا ہم اپنی زندگی اور موت کی مثال سے وجود و عدم کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں یا نہیں؟ ایسے سوالات نہ کرنا کہ جن کی وجہ سے حقیقتِ حال سے پردہ اُٹھ جائے، تو یہ مصلحت کی بات ہُوئی نہ کہ حقیقت کی، یہ شاید اس لئے کہ دُنیا ابھی اِس مرحلے پر نہیں پہنچی ہے، ورنہ ظاہر ہو جاتا کہ زمانے اور موجود و مخلوق کی اگر ابتدا ہے تو وہ جُزوی ہے، لیکن کُلّی طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز ایک دائرے پر واقع ہے اور دائرہ ہستی اور نیستی کے نوبت بہ نوبت آنے جانے سے بنا ہُوا ہے جیسے دن رات کے چکّر اور گردش سے لاابتدائی اور لاانتہائی کا تصور قائم ہو جاتا ہے۔

امامِ مستودع :-

سوال ۸ : حضرتِ حسنؑ کو کئی مُستند کتابوں میں امام مانا گیا ہے ہمیں ان کو کس درجے میں ماننا چاہیئے؟

جواب : حضرتِ حسن علیہ السّلام کو امام تسلیم کرنا بالکل درست اور صحیح ہے، لہٰذا ہم ان کو امام مانتے ہیں اور آپ بھی مانیں، حضرتِ حسنؑ کو امام نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں، آپ امامِ مستودع تھے، اسماعیلی مذہب کی جتنی مستند کتابوں میں حضرتِ حسن کا ذکر آیا ہے، اُن سب میں ان کی امامت مسلّمہ ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ایک اسماعیلی کو یہ سوال کیونکر پیدا ہُوا ہے، اس لئے کہ زمانے کے امام کے شجرۂ نسب میں امام حسن علیہ السّلام کا نام نہیں ہے، کیونکہ یہ شجرہ صرف امامِ زمان کے آباؤ اجداد ہی کا ہے نہ کہ امامت کے مختلف پہلوؤں کا، اور ان دونوں باتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں صرف امامِ حاضر ہی کے آباؤ اجداد کی امامت کو ثابت کرنا ہے اور دوسری صورت میں امامت کے مختلف مراتب کو بیان کرنا ہوتا ہے، چُنانچہ اگر امامِ وقت کے شجرۂ نسب کو آگے سے آگے بڑھا دیا جائے تو یہ شجرہ حضرتِ اسماعیلؑ اور حضرتِ ابراہیمؑ سے ہوتا ہُوا حضرتِ آدمؑ کی طرف چلا جائے گا، اور اس میں حضرتِ اسحاقؑ کی اور آپؑ کی اولاد کی امامت کا ذکر نہیں آئے گا، جس کی وجہ ظاہر ہے کہ امامِ زمان کو ابنِ امام ابنِ امام ثابت کرنا الگ بات ہے، اور نُورِ امامت کے مختلف ظہورات و درجات کی بات الگ ہے۔

اسماعیلی مذہب میں امام شناسی کا موضوع بنیادی اہمیّت کا حامل ہُوا کرتا ہے، جس کے بغیر دین کے میدان میں قدم قدم پر مشکلات سامنے آتی ہیں، لہٰذا اس موضوع کی طرف زیادہ سے زیادہ توجّہ دینے کی ضرورت ہے، جس کے سلسلے میں سب سے پہلے تاریخِ امامت کا گہرا مطالعہ نہایت ہی ضروری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امامت عام طور پر باپ سے بیٹے میں منتقل

ہوتی رہتی ہے، مگر خاص حالات میں اس کے اور بھی امکانات ہیں، جیسے مولانا ہابیلؑ کی امامت مولانا شیثؑ کو ملی تھی، یہ بھائی سے بھائی میں امامت منتقل ہو جانے کی ایک روشن دلیل ہے اور یہی مثال حضرتِ حسنؑ کی امامت حضرتِ حُسینؑ میں منتقل ہوجانے کی بھی ہے، یعنی وقت آنے پر امامِ مستودع کی نُورانی فضیلتیں امامِ مستقر میں ایک ہوجاتی ہیں۔

سائنسی انقلاب کے اِس دَور میں جہاں عقائد کے بارے میں نت نئے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہاں یہ بھی پُوچھا جا سکتا ہے کہ بتاؤ بیک وقت ایک سے زیادہ امام ہوسکتے ہیں یا نہیں، جبکہ موجودہ وقت میں یا آگے چل کر اس کائنات کے کئی سیّاروں پر انسان بستے ہوں؟ اس کے لئے ایسا جواب چاہیئے جس کا ثبوت دینِ حق میں پہلے سے موجُود ہو، اور وہ یہ ہے جو بولا جائے کہ کیوں نہیں، جبکہ بیک وقت مُحمّدؐ رسولؐ ناطق تھے علیؑ اساس اور حسنؑ و حسینؑ امام، چُنانچہ اگر اِس کائنات میں کسی بھی وقت ایک ساتھ کئی آباد دُنیائیں پائی جائیں تو ان سب میں ایک ایک امام کا ہونا لازمی امر ہے، کیونکہ کسی بھی دُنیا کا قیام امامِ حاضر کی موجودگی پر ہے، اس کے باوجُود وہ ایک سے زیادہ ائمۂ نفسِ واحدہ کی طرح ایک ہوتے ہیں، اِس مدلّل بیان میں حضرتِ حسن علیہ السّلام کی امامت کے ثبوت میں بہت سی روشن مثالیں موجود ہیں۔

قبر اور قیامت:۔

سوال ۹: کیا قیامت کے دِن ہماری رُوح سے اعمال کا

حساب لیا جائے گا یا قبر میں پُوچھا جائے گا؟ آیا مرنے کے بعد رُوح واپس آکر قبر میں داخل ہوتی ہے؟

جواب : ہم ترتیب کی وجہ سے یہاں سب سے پہلے قبر کے بارے میں بات کریں گے، کہ قبر ظاہری و باطنی دو قسم کی ہوتی ہے، ظاہری قبر کو تو سب لوگ جانتے ہیں، مگر باطنی یا رُوحانی قبر کا جاننا سب کے لئے کوئی آسان چیز نہیں، چُنانچہ جاننا چاہئے کہ رُوحانی قبر انسانی جسم ہی ہے، حضرتِ رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے کہ: "میری قبر اور میرے منبر کے درمیان بہشت کے باغات میں سے ایک باغ ہے"۔ پیر ناصر خسرو اپنی مشہور کتاب "وجہ دین" میں کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی قبر اساس یعنی علیؑ ہیں اور منبر قائم القیامت علیہ افضل التّحیّۃ والسّلام ہیں۔

جب یہ تاویل نظریۂ اسماعیلیّت کے مطابق صحیح اور درست ہے کہ مُحمّد رسول اللہ کی قبر آپؐ کے جانشین یعنی علی مُرتضٰےؑ ہیں، تو اس سے یہ معلوم ہُوا کہ ہر انسان کی رُوح کے لئے ایک زندہ قبر ہُوا کرتی ہے یعنی ایک زندہ جسم، اپنا ہو یا دُوسرے کا، اچھا ہو یا بُرا وہ تو اعمال کے مطابق ہوگا۔ بہر حال قبر کے بارے میں جتنے دینی ارشادات ہیں، ان کا تاویلی تعلق اِس زندہ قبر سے ہے نہ کہ خالص مٹی کی قبر سے اس کا مطلب یہ ہُوا کہ موت کے بعد آدمی کی رُوح فوری طور پر کسی زندہ جسم میں منتقل کر دی جاتی ہے، اور وہاں اُس سے شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر کچھ سوالات پُوچھے جاتے ہیں، پھر جب قبروں سے رُوحوں کے اُٹھ جانے کا زمانہ آتا ہے، یعنی جب کوئی باطنی اور رُوحانی قیامت برپا ہو جاتی ہے تو اس وقت لوگوں کے اعمال کا حساب لیا جاتا ہے۔

حاضر امام کا درجہ :-

سوال نمبر ۱۰ : ہم رُوحانیت اور نورانیت کے معنی میں امامِ زمان علیہ السّلام کو انتہائی عظیم مانتے ہیں، لیکن امام کے جسمانی تقدّس کا فلسفہ کس طرح پیش کیا جائے، جبکہ غیر اسماعیلی خصوصاً عیسائی ہم سے سوال کرتے ہیں ؟

جواب : ۱۰۔ ہاں، آپ کا پُوچھنا حق بجانب ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کی جسمانیت ہی لوگوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ ہے، لیکن عوام اپنے خیال کے مطابق جو کچھ سمجھتے ہیں وہ حقیقت نہیں ہے، حقیقت خُدا اور رسولؐ اور ائمّۂ ہدایتؑ کے ارشادات کی روشنی میں ملتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جس طرح روحوں میں فرق ہے اسی طرح جسموں میں بھی فرق ہے، کہ ارواح اور اجسام میں سے کچھ تو پاک و پاکیزہ ہیں اور کچھ ناپاک و نجس، اور سب سے پہلے پاک و مُقدّس ظاہراً و باطناً وہ حضرات ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے پاک و پاکیزہ اس لئے بنایا ہے کہ وہ لوگوں کو پاک کریں اور ہر قسم کی پلیدی و ناپاکی سے بچائیں، اس کے معنی یہ ہُوئے کہ پیغمبر اور امام صلوات اللہ علیہما خود پاک ہیں اسی لئے وہ اپنے تابعداروں کو پاکیزگی کا درس دیتے ہیں اور ان کو ہر طرح سے پاک کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن کی بہت سی آیتوں میں رسُولؐ کے اس کام کا ذکر آیا ہے کہ آنحضرت کس طرح لوگوں کو پاک کر دیتے تھے، اور سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۰ اور نمبر ۱۵۱ میں اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے کہ خُدا کی نعمت پُوری ہو جائے گی اور آئندہ کے لئے باقی رہے گی تاکہ تمہاری ہدایت میں کوئی کمی واقع نہ ہو، پھر فرماتا ہے کہ یہ نعمت وہی ہے جیسے ہم نے تمہارے درمیان تُم میں سے رسول پیدا

کیا جو تمہیں ہماری آیتیں (آفاق و انفس سے) پڑھ کر سُناتا ہے اور اس وسیلے سے تم کو پاک کر دیتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور نتیجے کے طور پر تُم کو وہ علم سکھاتا ہے جو کہ تُم نہیں جانتے تھے۔

اِس آیۂ کریمہ میں پیغمبرِ اکرمؐ اور امام برحقؑ کے اِس فعل کا ذکر ہے جس سے کہ وہ لوگوں کو پاک کر دیتے ہیں، چُنانچہ ظاہر ہے کہ رسُولِ خُداؐ اور امامِ زمانؑ پاک ہیں، جب مانا گیا کہ وہ پاک ہیں تو یہ بات بھی خود بخود حقیقت ثابت ہُوئی کہ ان کی بشریت کے تمام لوازم یعنی کھانا پینا شادی بیاہ وغیرہ تمام چیزیں پاک ہیں، پس پیغمبر اور امام نہ صرف رُوح اور نُور کے لحاظ سے پاک ہیں بلکہ جسم کے اعتبار سے بھی نہایت ہی پاک ہیں، لہٰذا وہ نُورِ الٰہی کے مظہر ہیں، اور آپ مظہرِ نُورِ خُدا کو جو بھی تعظیم کریں اور جتنا بڑا سمجھیں، وہ درست ہے، کیونکہ وہ خُدا کے ظہور کا درجہ ہے۔

۲۔ عیسائیوں کے عقائد کا مطالعہ کیا جائے یا براہِ راست اُن سے پُوچھا جائے کہ وہ حضرتِ عیسٰےؑ سے قبل کے بہت سے پیغمبروں کو مانتے ہیں یا نہیں؟ اگر وہ ان کو قبول کرتے ہیں تو اس کی یہ منطق بنتی ہے کہ جس طرح حضرتِ عیسٰےؑ سے پہلے ہدایت کا سلسلہ جاری تھا اسی طرح ان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ پیغمبرؐ اور امامؑ عیسٰےؑ کی طرح درویش ہوں، مثال کے طور پر آپ اس بات میں ذرا غور کریں کہ عیسٰےؑ نے زندگی میں کبھی شادی نہیں کی تھی، اور اگر یہ صفت ہر شخص کے لئے ضروری اور امر و فرمان کی حیثیت سے ہے تو بطورِ سُنّت کے تمام عیسائی اِس پر عمل کر کے دیکھیں، ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ اِس سے آئندہ نسل ختم ہو جاتی ہے، اور نہ وہ بحیثیتِ مجموعی عیسٰےؑ کی طرح درویش اور تارک الدّنیا بننا چاہتے ہیں، اِس بیان کا نتیجہ یہ نکلا کہ

حضرتِ عیسیٰؑ کے اپنے وقت میں پیغمبر برحق ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ سب پیغمبروں اور اماموں کی پیدائش، زندگی اور موت ایسی ہو جیسی عیسیٰؑ کی تھی۔

خُدا تعالیٰ:۔

سوال ۱۱: (الف) کائنات و موجودات کے لئے کسی خُدا کے ہونے کی کیا وجہ ہے؟

(ب) کیا یہ ممکن ہے کہ چھ دنوں کے اندر اندر ایک کائنات بنائی جائے؟

(ج) خُدا ہمیں کیوں دکھائی نہیں دیتا؟

(د) دُنیا میں ایسے لوگ کیوں موجود ہیں جو خدا کی ہستی سے منکر ہیں؟

جواب: یہاں پر چار سوال ہیں جو بہت عجیب اور بڑے دلچسپ ہیں، کیونکہ یہ اپنے پس منظر اور ماحول کی عکاسی کرتے ہیں، بہر حال بتانا یہ ہے کہ خُدا تعالیٰ کے وجود و ہستی کے ثبوت کے لئے ہزاروں وجہیں اور ہزاروں دلیلیں ہیں تاہم یہاں جو گنجائش ہے اس کے مطابق بات کریں گے کہ (الف) پہلے سوال کا اشارہ یہ ہے کہ کائنات و موجودات خود بخود وجود میں آئی ہے اور ہر چیز خود از خود قائم و باقی ہے، تو پھر کسی خدا کے وجود کی کیا ضرورت ہے، حالانکہ یہ تصوّر سراسر غلط ہے، اس لئے کہ اگر خدا نہ ہوتا اور کائنات اپنے آپ پیدا ہوئی ہوتی تو ایسی فطرت کے اس قانون کے تحت دُنیا میں کسی کاریگر کے بغیر خود بخود مصنوعات بنتی رہتیں، مگر سب دیکھتے ہیں کہ صنعت گر کے بغیر

کوئی مصنوع نہیں بنتی ہے، اس سے ثابت ہے کہ خالق کے بغیر اِس عالم کے وجود میں آنے کا نظریہ بنیاد ہی سے باطل اور قطعی طور پر غلط ہے اور صحیح یہ ہے کہ خدائے خالق نے اِس کائنات کو وجود دیا ہے اور اسی نے ہر چیز پیدا کی ہے۔

اِس منظم و مکمل کائنات کے خود بخود پیدا ہونے کا تصور اس قدر بے بُنیاد اور بیہودہ ہے کہ ایک معمُولی عقل والا انسان بھی اس کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ یہ نہ کوئی کامیاب سائنسی ریسرچ کی بات ہے اور نہ ہی کوئی صحیح منطق، بلکہ یہ باطنی عقل کے اندھوں کا خیال ہے۔

(ب) دُوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ چھ دنوں کے اندر اندر اِس عظیم کائنات کی تخلیق ناممکن نہیں، جبکہ خُدا تعالیٰ نے اِس عالم کو صرف "کُنْ" کے امر سے چشمِ زدن میں پیدا کیا ہے، اور چھ دن سے چھ بڑے پیغمبروں کے ادوار مُراد ہیں، جن میں بحیثیتِ مجمُوعی عالمِ دین پیدا کیا گیا، یعنی حضرتِ آدمؑ، حضرتِ نوحؑ، حضرتِ ابراہیمؑ، حضرتِ موسیٰؑ، حضرتِ عیسیٰؑ اور حضرتِ محمدؐ کے چھ ادوار اللہ تعالیٰ کے چھ دنوں کی مُدت ہیں جن میں اُس نے عالمِ دین کو مکمل کیا، خُدا کے یہ چھ دن اتوار سے شروع ہو کر جُمعہ تک پُورے ہوتے اور سنیچر یعنی حضرتِ قائمؑ خُدا کا وہ دن ہے جس میں کہ علم و معرفت کے تخت پر خُدا کا ظہور ہُوا۔

(ج) تیسرا سوال ہے: خُدا ہمیں کیوں نظر نہیں آتا؟ اس کا جواب ہے کہ یا تو تُم وہ آنکھ اپنے اندر پیدا کرو جس سے خُدا کا دیدار کیا جا سکتا ہے یا ایسے مومنوں کی بات پر باور کرو جو خُدا کو ہر جگہ عقل کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جس طرح کہ تُم سائنس کے معاملے میں یا تو تھیوری کی تُم خود ریسرچ کرتے ہو یا کسی کی

تھیوری کو قبول کرتے ہو۔

تُم آسمان کے سُورج کو جو ظاہر ہے اچھی طرح سے دیکھ نہیں سکتے ہو، اس لئے تُم چاہتے ہو کہ اسے پانی میں دیکھو، یا کسی ایسی عینک کے ذریعے سے، جو تُم کو سُورج کی اصل روشنی کم کر کے دکھاتے، اور ستاروں کو جو تُم سے بہت دُور بلندی پر ہیں کسی طاقتور دُوربین کے ذریعے سے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہو، اس طرح خُدا کو بھی دیکھنے کے لئے ایک خاص آنکھ کی ضرورت ہے۔

اِنسان کی جسمانی آنکھ اسی روز کُھلتی ہے جبکہ وہ پیدا ہو جاتا ہے، مگر وہ اس آنکھ سے دیکھنے کے باوجود دیکھ نہیں سکتا ہے، کیونکہ وہ ابھی بچّہ ہی ہے جو شناخت کے لحاظ سے حیوان کے بچّے سے بھی کمزور ہوتا ہے، حیوان کا بچّہ انسانی بچّے سے زیادہ شناخت اِس لئے رکھتا ہے کہ اس کی وہ محدُود قوّت قدرتی اور پیدائشی طور پر اس کے ساتھ ہوتی ہے، مگر انسان کے بچّے میں علم و معرفت کی ایک ایسی صلاحیّت ہوتی ہے جو صرف تعلیم و تربیت ہی سے لامحدُود ہو سکتی ہے، اور اگر بچّوں کی تعلیم و تربیت مذہبی طور پر نہیں کی گئی یا اس میں بڑی حد تک کمی رہی تو پھر انسان پہلے ہی کی طرح حیوان سے کمتر رہتا ہے۔

(د) چوتھا سوال ہے دُنیا میں ایسے لوگ کیوں ہیں جو خُدا کی ہستی سے منکر ہیں؟ جواب ہے کہ کیوں نہ ہُوں، جبکہ ایمان کے مقابلے میں کُفر اور دن کے ساتھ ساتھ رات ہے، اور دُنیا میں ہر چیز کی ضد کا ہونا لازمی ہے، تا کہ معرفت کا امتحان ہو۔

اگر تمہارے خیال کے مطابق کافروں کا وجود ہی خُدا کے نہ ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے، تو پھر دُنیا والے سب کے سب خُدا کی ہستی سے منکر اور کافر کیوں نہیں ہیں کہ بہت سے لوگ خُدا کو مانتے بھی ہیں؟

اگر سوال کا مطلب یہ ہو کہ "خُدا کا وجود ہوتا تو دُنیا میں کافر کا نام و نشان نہ ہوتا اور ہر جگہ ایمان کا دَور دورہ ہوتا" یہ بات بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ انسانوں کو اختیار دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ دو گروہ ہو گئے ہیں، یعنی اس جہان میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی۔

نُورٌ علیٰ نور :-

سوال ۱۲ : جب ایک امام کے بعد دُوسرا امام ہوتا ہے تو کیا اُس ہونے والے امام میں کوئی الگ رُوح ہوتی ہے؟ یا کہ وہ نُورِ امامت کے جُزو کی حیثیت سے ہوتا ہے؟ اگر مان لیا جائے کہ ہونے والا امام سابق امام سے مختلف ہوتا ہے، تو کیا نور کے ساتھ موجودہ امام کی رُوح کا کوئی رشتہ ہوتا ہے؟ یا کہ یہ رُوح ایک مومن کی رُوح کی طرح ہوتی ہے؟

جواب : اِس سوال کا جواب سورۂ نُور میں موجُود ہے، جہاں آیت ۳۵ میں حکمت کی زبان میں فرمایا گیا ہے کہ نُور کو اگر باطنی اور رُوحانی پہلو سے دیکھا جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے ایک ہی ہے جو پُوری کائنات کے لئے کافی ہے اور اگر ظاہری اور جسمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ ایک نور پر دوسرا نُور ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کہ ایک امام کے بعد دُوسرا امام ہوتا ہے، پس معلوم ہُوا کہ ہونے والے امام پر بھی موجودہ امام کی رُوح یعنی نور کی روشنی پڑتی رہتی ہے، جس طرح کہ ایک چراغ سے دُوسرا چراغ روشن کیا جاتا ہے یا جس طرح کہ سُورج سے چاند کو روشنی ملتی رہتی ہے اور فرض کرو کہ چاند مکمل ہو جانے کے بعد سُورج بن جاتا ہے، جیسا کہ قرآن (۷۵/۹) میں سُورج اور چاند کے ایک ہو جانے کا ذکر ہے مگر ظاہر

ISW Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

ہے کہ دُنیا کے سُورج اور چاند ایک نہیں ہو سکتے، امام اور اس کا جانشین (یعنی ہونے والا امام)، ایک ہو جاتے ہیں۔

ازل میں تمام رُوحیں ایک تھیں اور ابد میں بھی ساری رُوحیں ایک ہو جائیں گی جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے: تمہاری ابتدائی پیدائش اور تمہاری آخری بعثت ایک جان کی طرح ہے (۲۸/۳۱) جب عام رُوحوں کی وحدت کا یہ عالم ہے کہ وہ شروع میں بھی ایک تھیں اور آخر میں بھی ایک ہو جائیں گی، تو پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ امام اور امام کی دو الگ الگ رُوحیں ہوں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمام ائمہ کا نور ایک ہے اور رُوحِ امام سے نور مراد ہے۔

اِسی جواب سے سوال کا باقی حصّہ ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس میں سوال کو دُہرایا گیا ہے، تاہم بتا دیا جاتا ہے کہ اماموں کے اجسام الگ الگ ہیں مگر ان کا نُور ایک ہی ہے، جسم نُور کا جُزو نہیں ہے مگر بعض دفعہ نور کی وجہ سے جسم کو بھی نُور کہا گیا ہے، اور نُورٌ علیٰ نور میں یہی بات ہے۔

ایک امام کا رشتہ دُوسرے امام سے یہ ہے کہ دونوں کا نور ایک ہی ہے، امام کی رُوح مومن کی رُوح کی طرح نہیں ہے بلکہ نہایت ہی اعلیٰ ہے، ہاں مومن کی رُوح انتہائی ترقّی کے بعد امام کے نور سے واصل ہو کر ہی امام کی رُوح کی طرح ہو سکتی ہے۔

صلوات :-

سوال ۱۳ : اگر پیغمبرؐ اور امامؑ نُور ہیں تو صلوات میں ان کے لئے رحمت مانگنے کے کیا معنی ہیں؟

جواب: یہ سوال صلوات کے عام معنی سے پیدا ہوا ہے، مگر صلوات کی تاویل ایسی نہیں، آپ کتاب "وجہِ دین" حصۂ دوم کلام نمبر ۵۰، فلسفۂ دُعا صفحہ ۶۱ تا ۶۹ اور پنج مقالہ نمبر ۴ صفحہ ۲۷ تا ۲۹ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کی تاویل پر غور کر سکتے ہیں، کہ جہاں صلوات محمدؐ و آلِ محمدؑ کی شان میں ہوتی ہے وہاں اس کی مراد ہے ان حضرات کے وسیلے سے اپنے لئے درود مانگنا اور صحیح معنوں میں ان مقدس رہنما ہستیوں کی پیروی کرنا۔

جاننا چاہئے کہ صلوات کے معنی اور تاویل کے کئی پہلو ہیں، جیسے (الف) اللہ تعالیٰ کی صلوات آنحضرتؐ کے لئے (۳۳/۵۶) (ب) فرشتوں کی صلوات حضورؐ پر (۳۳/۵۶) (ج) مومنین کی طرف سے صلوات پیغمبر اکرمؐ کے لئے (۳۳/۵۶) (د) اللہ پاک کی صلوات مومنین پر (۲/۱۵۷، ۳۳/۴۳) (ہ) ملائکہ کی صلوات مومنین پر (۳۳/۴۳) (و) رسولِ خداؐ کی صلوات مومنین پر (۹/۹۹، ۹/۱۰۳) چنانچہ صلوات میں کئی تاویلی حکمتیں پوشیدہ ہیں، بہر حال آپ کے سوال کا جواب اس بیان میں دیا گیا ہے۔

ذکر و بندگی

سوال نمبر ۱۴: علّامہ صاحب اگر آپ مہربانی سے ذکر و بندگی کے بارے میں کچھ بتاتے، مثلاً اس کی ضرورت و اہمیت، طریقِ کار، ذکر بر ارتکازِ توجہ، ذکر کے ساتھ تنفّس کی ہم آہنگی، اور خوراک کے سلسلے میں کچھ تذکرہ کرتے تو میں آپ کا بہت ہی شکر گزار ہو جاتا؟

جواب: یہ تو آپ نے ایک سوال نہیں کیا بلکہ ایک بڑا لیکچر دینے کے لئے فرمائش کی بہر حال بہتر یہ ہے کہ اس موضوع کو اچھی طرح سے سمجھنے کے

ISW Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

لئے "ذکرِ الٰہی" کو پیشِ نظر رکھیں، جو میری ایک کتاب ہے جو ذکر و عبادت کے سلسلے میں گائیڈ بک کی حیثیت سے ہے، اس کے علاوہ میرے کینیڈا کے دَورہ کے کیسٹوں کو سُنیں، نیز میری کتاب پنج مقالہ ۲ میں سورۂ مزّمّل کی تفسیر و تاویل کو پڑھیں۔

کتاب "ذکرِ الٰہی" کو جانِ عزیز فقیر محمّد ہونزائی اور محترمہ زرین رحیم قاسم نے انگلش میں منتقل کیا ہے، لہٰذا یہ کتاب اب آپ کو انگلش میں بھی ملے گی۔

حضرتِ عیسیٰؑ اور حضرتِ محمدؐ:-

سوال ۱۵: اگر حضرتِ محمدؐ کو پہلے ہی سے پیغمبری کے لئے انتخاب کیا گیا تھا تو وہ جبرائیل کے وحی لانے کے وقت اتنا حیرت زدہ کیوں ہوگیا؟ حضرتِ محمدؐ حضرتِ عیسیٰؑ کی طرح کیوں پیدا نہیں ہُوئے، جن کی ولادت کے وقت ایک شہابِ ثاقب کا طلوع ہُوا تھا؟ حضرتِ محمدؐ وفات سے قبل تکالیف کے مراحل سے کیوں گزرے؟

جواب: آپ کے یہ تینوں سوالات غیر منطقی اور بے حقیقت ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ عیسائی تبلیغ کی پیداوار ہیں، بہرحال ان کی تحلیل کی جاتی ہے، کہ ہر سوال کی کوئی نہ کوئی بُنیاد ہوا کرتی ہے، چُنانچہ یہاں پہلے سوال کی بُنیاد اس بات پر قائم کی گئی ہے کہ آنحضرتؐ پر نزولِ وحی قبول کیا گیا ہے پھر اسی وحی کے نتیجے میں رسُولِ خداؐ پر اعتراض کیا گیا ہے، حالانکہ کسی ہستی کو پیغمبر تسلیم کرنے کے بعد اس پر اعتراض کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور یہ کوئی منطق ہی نہیں کہ خود جبرائیل کے وحی لانے کو دلیل بنا کر آنحضرتؐ کی نبوّت کی نفی کے لئے کوشش کی جائے،

کیونکہ حضور اکرمؐ کو نبی اور رسول ماننے کے بعد یہ سوال خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

دُوسری طرف سے اِس سوال کا مفہوم یہ ہے کہ سائل کے بقول اگر حضرتِ مُحمدؐ کو پہلے ہی سے اپنے انتخاب کا پتا ہوتا تو آپ کو نزولِ وحی سے حیرت نہ ہوتی، تو کیا یہ بھی کوئی دلیل ہو سکتی ہے کہ جس سے آنحضرتؐ کی نبوّت کی تردید ہو، کیونکہ اگر ہم حضورؐ کی ایسی حیرت کو قبول بھی کریں تو اس کا نتیجہ صرف یہی نکلتا ہے کہ حضور کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے آپؐ کو نبوّت و رسالت کے لئے منتخب کیا ہے۔

اگر رُوحانی عِلم اور معرفت کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات غیر یقینی ہو کر رہ جاتی ہے کہ آنحضرت کو جبرائیل کے وحی لانے سے کوئی حیرت ہُوئی تھی، کیونکہ راہِ رُوحانیت ایسی نہیں کہ ایک دن میں یکایک مقامِ وحی سامنے آئے، وہ تو بہت سے رُوحانی عجائبات و تجربات کے بعد آتا ہے، اور اس کے لئے خُوب تیاری ہوتی ہے۔

ظاہری روایت اور عام تاریخی قِصّوں کا سہارا لے کر وحی کی حقیقت سمجھنے کے لئے کوشش کرنا بہت بڑی نادانی ہے، اور اِس سوال میں ایسا کیا گیا ہے، لہٰذا اس میں جو کوشش کی گئی ہے وہ غلط اور باطل ہے۔

شہابِ ثاقب کو بہت بڑا معجزہ قرار دے کر ہر پیغمبر کی پیدائش کی علامت سمجھنا بھی کچھ چھوٹی غلطی نہیں، کیا کوئی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ سے قبل جتنے پیغمبر ہُوئے ہیں اُن سب کی پیدائش کے وقت شہابِ ثاقب طُلوع ہوتا رہا ہے یا یہ ثابت کر سکتا ہے کہ جب بھی کوئی شہابِ ثاقب طُلوع ہوتا ہے تو اس کا اشارہ یہ ہے کہ دُنیا میں کسی پیغمبر کا ظہور ہوتا ہے؟ اہلِ دانش کے نزدیک ایسی باتیں بچگانہ طرز کی لگتی ہیں، کہ ان میں نہ تو کوئی دینی فلسفہ ہے اور نہ ہی کوئی سائنسی توجیہہ ہے۔

یہی مثال اس سوال کی بھی ہے جو پوچھا گیا ہے کہ حضرتِ محمدؐ وفات سے قبل تکالیف کے مراحل سے کیوں گزرے؟ جبکہ اس کا جواب اس طرح سے دیا جاسکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے بہت سی تکالیف اس لئے اُٹھائیں کہ انبیاء علیہم السّلام کو انسانی زندگی کا نمونہ پیش کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بحیثیتِ مجموعی پیغمبروں کی زندگی تکالیف سے پُر ہے، اور خود حضرتِ عیسیٰؑ کے بارے میں غور کیا جائے کہ وہ کس طرح درویشی کی زندگی گزارتے تھے، اور ان کی جسمانی موت بھی ایسی نہیں جیسے وہ سمجھتے ہیں، بلکہ وہ تختۂ دار پر ایک مکمّل شہادت کی صورت میں واقع ہوئی تھی۔

نُور کہاں سے آیا؟:-

سوال ۱۶ : نُور کا آغاز کس طرح سے ہُوا؟ نُور کہاں سے آیا؟

جواب : یہ کوئی ضروری اور لازمی نہیں کہ ہر چیز کا کوئی آغاز ہو اور وہ کسی خاص وقت میں پیدا ہو کر اپنا کام شروع کرے، کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی کوئی ابتداء ہی نہیں، یعنی وہ کسی آغاز کے بغیر ہی ہمیشہ ہمیشہ موجود ہیں، انسان جس ماحول میں پلا ہے اور جیسی اس ظاہری دُنیا کے محدود زمان و مکان کے زیرِ اثر اس کی عادت بنی ہے، وہ ہمیشہ اِسی کے مطابق سوچتا اور سوال کرتا ہے، اُس نے مذہب کی عام سے عام ابتدائی تعلیم سے متعلق روایات یا تاویلی مثالوں کے ظاہری پہلو کے ذریعے سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ شروع شروع میں خُدا تعالیٰ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا، اور وہ ایسی اوّلیت کو خُداوندِ برحق کی سب سے بڑی صفت قرار دیتا ہے، حالانکہ اگر حقیقت میں دیکھا جائے

تو یہ بات اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس اور شانِ عالی کے خلاف ہے کہ ہم اس کو کسی ہم جنس کی طرح زُمرۂ خلائق میں لاکر کوئی مشترکہ صفت بیان کریں، جیسے کسی شخص کا یہ کہنا کہ "سب سے پہلے خُدا تھا"۔

آپ خُوب سنجیدگی سے دیکھیں کہ اس بیان میں خُدا کے تصوّر کو تمام موجودات و مخلوقات کے تصوّر کے ساتھ ملا کر شمولیت و شرکت کا مسئلہ پیدا کیا گیا ہے، اور اس کے بعد تقابلی تصوّر کی مدد سے ذاتِ سُبحان کو اوّلیتِ زمانی دی گئی ہے، یہ ایک مثال ہے کہ عوام کس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو باری تعالیٰ کی صفات سمجھتے ہیں۔

اب بیانِ مذکورۂ بالا کی روشنی میں یہ جاننا ضروری ہے کہ بُنیادی تقسیم کے لحاظ سے عالم دو ہیں، جو عالمِ خلق اور عالمِ امر ہیں (۷/۵۴) عالمِ خلق حادث ہے اور عالمِ امر قدیم، حادث ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو ہمیشہ سے نہیں ہے بلکہ زمانہ کی حد کے اندر پیدا ہُوئی ہے، اور قدیم وہ ہے جو حادث کے برعکس ہمیشہ سے موجود ہو، چُنانچہ نور حادث نہیں قدیم ہے، لہٰذا وہ ہمیشہ سے ہے اور جو چیز ہمیشہ سے ہو، اس کے آغاز کے بارے میں سوال پیدا نہیں ہو سکتا ہے، اب رہا سوال کہ "نُور کہاں سے آیا" سو اس کا جواب ہے کہ نور عالمِ امر سے ہے، یعنی عالمِ رُوحانی سے، جو قدیم ہے، اور نور کا دُوسرا نام رُوح ہے جو حضرت آدم علیہ السّلام میں پھونکی گئی تھی، جس کا سرچشمہ عالمِ امر ہے" جیسا کہ ارشاد ہُوا ہے:۔

اور (اے رسُولؐ) آپ سے رُوح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ رُوح (عالمِ خلق سے نہیں بلکہ یہ) میرے پروردگار کے (عالمِ) امر سے ہے اور تُم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے (اس لئے تُم رُوح کی حقیقت نہیں

سمجھ سکتے ہو ۸۵/۱۷)، یہ قرآنی تذکرہ کامل رُوح یعنی رُوحِ قدسی کا ہے، جس کی وجہ سے آدمؑ کو فرشتوں نے سجدہ کیا تھا (۲۹/۱۵) یہی رُوح تھی جو خُدا کی رُوح کہلائی، اسی رُوح کے سبب سے عیسیٰؑ کو رُوحُ اللہ کا درجہ دیا گیا (۱۷۱/۴) اور یہی خُداوندی رُوح حضرتِ محمّد مُصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی پاک و پاکیزہ شخصیت میں رُوحِ قرآن اور نُورِ یزدان کی حیثیت سے کام کرتی تھی (۵۲/۴۲) پس رُوح اور نُور ایک ہی حقیقت ہے جو قدیم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے، اور اس کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی کوئی انتہا، وہ عالمِ امر سے ہے۔

جِنّ:-

سَوال ۱۷: آپ نے جِنّ کے بارے میں تذکرہ کیا، سو اگر جنّات کی ایک الگ دُنیا ہے اور وہ اس میں ہماری طرح رہ کر زندگی گُزارتے ہیں تو کیا آپ اس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟

جواب: آپ قرآنِ پاک کے کسی ترجمے کو سامنے رکھیں اور کسی عُمدہ انڈکس کی مدد سے دیکھیں تو آپ کو جنّات کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم ہو جائیں گی، وہ عنوانات اس طرح سے ہیں:-

جانّ ۷ دفعہ، الجِنّ ۲۲ دفعہ، جِنّۃ ۱۰ دفعہ، اِس کے علاوہ یہاں بھی چند باتیں بتائی جاتی ہیں کہ لفظِ جِنّ چھپنے اور چھپانے کے معنی میں آتا ہے، اِس لئے جِنّ اُس مخلوق کو کہتے ہیں جو ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے، جو جِنّات سیّارۂ زمین پر رہتے ہیں وہ آدمیوں کے ساتھ ہیں ان کی کوئی الگ دُنیا نہیں مگر بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ اکثر غیر آباد مقامات پر رہنا پسند

کرتے ہیں، جیسے پہاڑ، بیابان، صحرا وغیرہ، شاید اِس لئے کہ ان کو غذائیں صاف ہواؤں سے میّسر آتی ہیں یا ایتھر سے، نیز ان کی الگ دُنیائیں بھی ہیں یعنی وہ اُن سیّاروں پر بھی رہتے ہیں جو ہماری طرح کے اِنسانوں سے خالی پڑے ہیں، جب سیّارۂ زمین پر اِنسانوں کی آبادی نہیں ہُوئی تھی تو اُس وقت یہاں جنّات کی کثرت تھی، کیونکہ قانونِ قدرت یہی ہے کہ ظرف خالی نہ رہے، برتن میں اگر دُودھ نہیں تو پانی ہونا چاہئے، اگر پانی بھی نہیں ہے تو خود بخود اس میں ہَوا بھر جائے گی، یہ وسیع وعظیم کائنات عالمگیر رُوح کے سمندر میں ڈوبی ہُوئی ہے، اس لئے سوال پیدا نہیں ہوتا ہے کہ اتنی ساری رُوحیں کہاں سے پیدا ہُوئیں کہ کسی نہ کسی شکل میں تمام ستاروں اور سیّاروں پر مخلوقات موجود ہوں۔

جنّ اور پری کا ایک ہی مطلب ہے، جنّ عربی ہے اور پری فارسی، جنّات شکل وصورت میں آدمیوں کی طرح ہیں، کیونکہ ان دونوں کی ذات ایک ہی ہے، اور وہ ایک ہی دائرے پر چکّر لگاتے ہیں، وہ دائرہ دونوں جہان کے درمیان ہے۔

جنّات میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی، جس طرح انسانوں میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی، جنّات کو آگ سے پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ جسمِ لطیف میں ہیں، جس کو آسٹرل باڈی کہتے ہیں۔

اُڑن طشتریاں:-

سوال ۱۸ : خلائی کشتی اور اُڑن طشتریوں کے بارے میں بہت سے تضادات پیدا ہُوتے ہیں، کیا اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دُوسرے

ستاروں پر بھی کسی قسم کے لوگ رہتے ہیں؟

جواب : آپ کا سوال اگرچہ بہت بڑا سوال ہے (کیونکہ اگر سائنس دان اپنی بے پناہ ترقی کے ساتھ ساتھ یہ بھی جان لیتے کہ کون ہیں جو آسمان سے آ رہے ہیں تو ان کے لئے خلا میں کوئی مشکل پیش نہ آتی) لیکن دینِ حق میں یہ سوال مشکل نہیں ہے، لہٰذا آپ میری ایک کتاب "میزان الحقائق" میں دیکھیں، اس کے علاوہ یہاں پر بھی مختصر ذکر کیا جاتا ہے جیسا کہ سوال ۱۷ کے جواب میں جنّات کے تذکرہ کے سلسلے میں بتایا گیا کہ کوئی ستارہ مخلوقات سے خالی نہیں، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ فلائنگ ساسرز آتی رہتی ہیں مگر لوگ پہچان نہیں سکتے ہیں کہ وہ کیا مخلوقات ہیں، سو جاننا چاہیئے کہ وہ آسٹرل باڈی والے انسان ہیں، جو کسی ستارے پر یا بہت سے ستاروں پر رہتے ہیں، اور ہاں ان کی مذہبی اور سائنسی ترقّی بہت آگے بڑھ چکی ہے، یہاں تک کہ وہ جسمِ لطیف کے ذرّات کو طرح طرح کی شکلوں میں جوڑ کر ہر چیز کو پیش کر سکتے ہیں، وہ ظاہر بھی ہو سکتے ہیں اور غائب بھی۔

یو ایف اوز (UNIDENTIFIED FLYING OBJECT) رُوحانی دور کے آغاز ہو جانے کی نشانیاں ہیں، آگے چل کر انسان ان آسمانی طاقتوں سے فائدہ اُٹھانے والا ہے، مگر خُدا کی خدائی اور اس کی قُدرت کے لئے اقرار کئے بغیر ان رُوحانی طاقتوں پر قابُو پانا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

اگر وقت مل سکا تو انشاء اللہ ہم یو ایف اوز پر ایک چھوٹی سی کتاب تصنیف کریں گے، جو رُوحانی تجربات اور قرآنی ارشادات کی بُنیادوں پر مبنی ہو گی، تاکہ نہ صرف مذہبی طور پر مقبول ہو بلکہ سائنسی لحاظ سے بھی مُفید ہو سکے، اس سلسلے میں "تبدّلِ اجسام" کے مضمون کو بھی پیشِ نظر رکھنا، جو سوال ۲۲ کا جواب ہے۔

قیامت

سوال ۱۹ : مہربانی کر کے "قیامت" کے موضوع پر کچھ روشنی ڈالیں، کیا قیامت کے لئے کوئی خاص دن مقرر ہے؟

جواب : جاننا چاہئے کہ قرآن اور اسلام میں "علمِ قیامت" سب سے مخفی علم ہے، اور اسماعیلیت میں بھی قائم القیامت اور قیامت رُوحانیت کے بھیدوں میں سے ہیں، اور اس کے ایسے ہونے میں اللہ تعالیٰ کی بڑی مصلحت و حکمت ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرتِ آدمؑ سے قبل کے دینی واقعات اور حالات قرآن میں پوشیدہ ہیں کیونکہ آدمِ صفیؑ اُس زمانے کے قائم کا خلیفہ تھا، چُنانچہ اگر اگلے دَور کے قائم اور قیامت کا تذکرہ کیا جاتا تو پھر آئندہ قائم اور اس کی قیامت کے سارے بھید ظاہر ہو جاتے اور وہ ہرگز بھید نہ ہوتے، لہٰذا خُدا تعالیٰ نے آدم اور قبلِ آدم کے واقعات کو یا تو انسانوں کے سامنے ہی نہیں لایا، یا پھر اس طرح سے انکا ذکر کیا کہ صرف اہلِ دانش ہی سمجھیں اور عوام سے پوشیدہ رہیں۔

اس کے معنی یہ ہُوئے کہ علمِ قیامت تاویلات میں سے ہے اور قیامت کی عملی تاویل کرنا یہ ہے کہ کوئی حقیقی مومن تزکیۂ نفس اور رُوحانی ترقّی کے وسیلے سے اپنے باطن میں واقعۂ قیامت کا مشاہدہ کرے، اگر کوئی خُوش نصیب اِنسان اس مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتے، تو پھر بھی خوف ہے کہ وہ دُوسروں کو سمجھا سکتا ہے یا نہیں۔

بہرکیف قیامت باطنی اور رُوحانی طور پر ہمیشہ جاری ہے، اور قرآن نے اسی معنیٰ میں ہر زمانے کے لوگوں سے کہا ہے کہ قیامت بہت ہی نزدیک ہے،

رُوحانیت کے لحاظ سے بھی اور موت کے اعتبار سے بھی، پس اگر "من مات فقد قامت القیامۃ" (جو مر جائے تو اس کی قیامت برپا ہو جاتی ہے) کو اُصول بنائیں تو نتیجے کے طور پر یُوں کہنا ہوگا کہ جسمانی موت سے پہلے نفسانی طور پر مر جاتا ہے اپنے باطن کو پاک کرتا ہے اس کی بھی قیامت برپا ہو جاتی ہے، اور اگر کسی ملک پر یا تمام دُنیا والوں پر کوئی بڑے سے بڑا خوف مسلّط رہے تو اُن پر بھی نفسانی موت واقع ہوگی اور قیامت کا منظر سامنے ہوگا، اِس بیان سے ظاہر ہے کہ قیامت ہمیشہ جاری بھی ہے اور اس کے خاص خاص اوقات بھی ہیں، تفصیل کے لئے میری ایک کتاب "میزان الحقائق" میں دیکھیں۔

دُنیا میں کیوں آگئے؟

سوال ۲۰: ہمیں کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا؟ یا ہمیں اِس دُنیا میں کیوں بھیجا گیا؟

جواب: جاننا چاہئے کہ ہم کو پیدا کرنے اور اِس دُنیا میں بھیج دینے کا صرف ایک مقصد نہیں بلکہ بہت سے مقاصد ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر بہت ضروری ہے، تاہم ان میں ایک سب سے اعلیٰ مقصد بھی ہے جو تمام دینی اور دُنیاوی مقاصد پر محیط اور حاوی ہے، اور وہ عبادت و معرفت ہے، یہاں عبادت سے مُراد وہ تمام نیک اعمال ہیں جن کے بغیر مومن کو دین اور ایمان کا درجۂ کمال حاصل نہیں ہو سکتا ہے اور اِس معرفت میں تمام معرفتیں شامل ہیں اور اس معرفت سے کوئی معرفت باہر نہیں۔

علم و عمل اور عبادت و معرفت اُس دُنیا میں آنے کے بعد ممکن ہے اور

اس کے بغیر ناممکن ہے، یہ حقیقت ہے کہ دُنیا کھیتی باڑی ہے آخرت کے لئے، لہٰذا دُنیا کے بغیر آخرت آباد نہیں ہو سکتی ہے، اگر دُنیا کے بغیر آخرت چل سکتی تو ہم دُنیا میں ہرگز نہ آتے، ظاہر بات ہے کہ دُنیا میں آنا ضروری تھا اس لئے ہمیں یہاں بھیجا گیا۔

بہشت اور دوزخ:۔

سوال ۲۱: قرآن میں جو بہشت اور دوزخ کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں اسماعیلیت کا کیا نظریہ ہے؟

جواب: قرآنِ مقدّس میں بہشت و دوزخ کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ حق ہے، مگر ہماری زیادہ سے زیادہ تسلّی حکمت اور تاویل میں ہے، چنانچہ بہشت کائنات و موجودات کے باطن کی حیثیت سے ہے، یعنی وہ قرآنی ارشاد کے مطابق آسمان و زمین کے طول و عرض میں واقع ہے، جس میں بموجبِ آیۂ کریمہ: لَهُمْ مَّا يَشَاءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۳۵/۵۰) ان کے لئے اس (بہشت) میں سب کچھ ہوگا جو کچھ کہ وہ چاہتے ہیں اور ہمارے پاس اس کے علاوہ بھی ہے) وہ تمام نعمتیں موجود ہیں جن کی انسان خواہش رکھتا ہے اور وہ نعمتیں بھی ہیں جن کا شوق ابھی انسان میں پیدا نہیں ہوا ہے، جیسے جذبۂ دیدارِ الٰہی، اصل میں داصل ہوجانا، ازلی و ابدی سلطنت وغیرہ۔

جب جنّت کی نعمتیں خواہش کی بنیاد پر ہیں تو دیکھنا ہوگا کہ ہماری خواہش کی کتنی قسمیں ہیں، اگر ہم میں عشقِ حقیقی موجود ہے تو ہماری ہستی کا سب سے اعلیٰ عنصر ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں عشقِ حقیقی کی خواہشات، عقل کی خواہشات، روح

کی خواہشات اور نفس کی خواہشات، خواہشات کی چار قسمیں ہیں اس لئے معلوم ہُوا کہ جنّت کی نعمتیں سب سے پہلے دیدارِ خُداوندی کی صُورت میں ہیں، پھر عقلی و علمی نعمتیں ہیں، اس کے بعد رُوحانی لذّتوں کی حیثیت سے ہیں اور آخری نعمتیں نفسانی شکل کی ہیں مگر وہ بھی کثیف نہیں بلکہ لطیف۔

یہ بہشت باطنی اور رُوحانی ہے، لہٰذا اس میں مومن نہ صرف موت کے بعد داخل ہو سکتا ہے بلکہ وہ اِس زندگی میں بھی جُزوی طور پر جنّت کا مشاہدہ کر سکتا ہے، چُنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جو مومنین خصُوصی بندگی کے ذریعے سے رُوحانیت کے اعلیٰ درجے تک ترقی کر چکے ہیں وہ دل کی آنکھ سے بہشت کو دیکھ رہے ہیں جب وہ اِس دُنیا سے فارغ ہو جائیں گے تو اس وقت وہ کُلّی طور پر جنّت کو دیکھتے رہیں گے۔

قرآنی ارشاد (۲۹/۶۴) کے مطابق آخرت کا گھر زندہ ہے، اور زندہ اِنسان اور حیوان ہے، اِس سے ظاہر ہے کہ بہشت کے عقل و جان والے محلّات پیغمبرؐ، امامؑ اور حقیقی مومنین ہیں، جن کے اندر اگر خُدا کے نُور کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ رُوحانیت کی وہی بہشت موجُود ہے جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اور دوزخ کے تنگ مکانات حیوانات ہیں اور جو لوگ قرآن کے (اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۷/۱۷۹، کے) فیصلے کے مطابق جانوروں میں شامل ہو چکے ہیں وہ بھی جہنّم کے گھروں میں سے ہیں۔

اِس مقام پر اگر مَیں اپنے رُوحانی مشاہدات و تجربات کی کوئی بات کروں تو شاید بیجا نہ ہو گا، اور وہ یہ ہے کہ جب میں ملکِ چین میں روحانیت کا بھرپور کورس کر رہا تھا تو اس وقت میں نے اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے ایک کُتّے کو دیکھا جو آہستہ آہستہ گُزرتا تھا جس کے ساتھ لاتعداد رُوحیں وابستہ تھیں

یہ ادنیٰ روحیں کُتّے کی اپنی رُوح کے علاوہ تھیں، میں یہ حالت سامنے سے مُشاہدہ کرتا تھا، اس وقت میری ظاہری آنکھ اور باطنی آنکھ مل کر ایک ہوگئی تھیں، دُوسری دفعہ ایک بلّی میں ایسا مشاہدہ ہُوا کہ انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرّات پر سوار رُوحیں بلّی سے خارج پھر داخل ہوجاتی تھیں، گویا وہ جہنّم کے اُس تنگ مکان سے گریز کرنے کی ناکام کوشش کرتی تھیں، مگر کوئی قُدرتی طاقت ان کو واپس لاتی تھی، جب میں آخری دفعہ قید میں تھا تو ایک رات مَیں نے دل کی آنکھ سے مشاہدہ کیا کہ وہاں دُور یا نزدیک اصطبل میں کوئی گھوڑا تھا یا گھوڑے تھے، اُن میں اسی طرح بے شمار رُوحوں کا آنا جانا نظر آتا تھا، حالانکہ مَیں قید کی چار دیواری میں تھا اور سامنے سے ظاہری طور پر دیکھنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

یاد رہے کہ اِنسانوں میں اور حیوانوں میں دو قسم کی رُوحیں رہا کرتی ہیں، ایک قسم کی رُوحیں ان کی اپنی رُوحیں ہیں جو انسانوں کو اور جانوروں کو زندہ رکھتی ہیں، اور دُوسری رُوحیں ان کو مستقل یا عارضی گھر کے طور پر استعمال کرتی ہیں، چُنانچہ جب کوئی نیک اِنسان خُدا و رسُولؐ اور صاحبِ امرؑ کی مرضی کے مطابق علم و عمل کے ذریعے ریاضت کرتا ہے تو نتیجے کے طور پر اس میں اچھی رُوحیں آتی ہیں، اس کی اپنی رُوح بھی سُدھر جاتی ہے، وہ ان رُوحوں کو دیکھ سکتا ہے اور یہ اس کی رُوحانیت ہے، جس میں نہ صرف خُدا کی معرفت ہے بلکہ بہشت اور دوزخ کا مشاہدہ بھی ہے۔

نظامِ ہدایت :-

سوال ۲۲ : کہا جاتا ہے کہ خُدا تعالیٰ کے پیغمبروں نے ہر زمانے

یں بنی نوعِ انسان کی ہدایت و رہنمائی کی ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ دُنیا کے مختلف برِّاعظموں کو ہدایتِ الٰہی کا کس طرح برابر برابر فائدہ ملا؟

جواب : یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کے جواب میں دین شناسی کی بہت سی مُفید باتیں آسکتی ہیں، چُنانچہ جاننا چاہیئے کہ مذہب اور سائنس ایک دریا یا ایک ندی کی طرح اصل میں ایک ہیں، لیکن زمانے میں آگے بڑھتے بڑھتے بعض دفعہ اس کی دو شاخیں بھی بنتی ہیں، یعنی ایک شاخ کا نام مذہب ہوتا ہے اور دُوسری شاخ کا نام سائنس، کبھی مذہب میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی سائنس میں، مگر ہمیشہ کے لئے یاد رہے کہ جہاں مذہب اور سائنس ایک ہیں تو باطن اور ظاہر ایک ہیں اور جہاں یہ دونوں الگ الگ ہیں تو جاننا چاہیئے کہ وہاں مذہب انسان کی ترقی کا باطنی اور رُوحانی پہلو ہے اور سائنس اس ترقی کا ظاہری اور مادّی پہلو ہے، اس منطق کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جو بات یا جو کام انسان سائنس کی مادّیت سے کر سکتا ہے تو وہ مذہب کی رُوحانیت سے بھی کیا جا سکتا ہے، مثلاً اگر آج سائنسی طاقت کے بل بوتے پر ہزاروں میل دُور کے انسان آپس میں بات چیت کر سکتے ہیں، تو ہم کیوں یقین نہ کریں کہ رسُول اللہؐ کے نوُر سے دُنیا کے تمام ممالک میں ہدایت جاتی تھی، کیونکہ آپ اس کے بغیر کُل جہانوں کے لئے رحمت نہیں ہو سکتے تھے، دُنیا کے بارہ جزیروں میں آنحضرتؐ کے چوبیس ۲۴ حجّت تھے، اور آپؐ کے حضور میں چار تھے، ان سب کا نام جاننا ضروری نہیں ہے، جس طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا نام ضروری نہیں، مگر ان کے وجُود کے لئے اقرار ضروری ہے، سوائے نبی اکرمؐ کے حجّتِ اعظم کے نام کے کہ وہ علیؑ ہے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی جو تعداد بتائی جاتی ہے وہ اس طرح

سے نہیں کہ وہ یکے بعد دیگرے دُنیا میں آئے ہوں، بلکہ وہ ایسے ہیں کہ زمانے میں کوئی ایک پیغمبر ہدایت کے مرکز کی حیثیت سے ہوا کرتا تھا باقی اس کے حُجتوں اور داعیوں کی حیثیت سے دُنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہُوئے ہوتے تھے، اور ہادیٔ برحق کے مرکز سے ان حدودِ دین کو ان کے مرتبہ کے مطابق رُوحانی ہدایت مِلتی رہتی تھی۔

سُنّی کہتے ہیں کہ معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ سے جو کلام کیا تھا وہ حضرتِ ابوبکر کی آواز میں کیا تھا، شیعہ کہتے ہیں کہ خُدا کا وہ سارا کلام حضرتِ علیؑ کی زبان سے تھا، میں اس بارے میں ذاتی طور پر جو کچھ کہنا چاہتا ہُوں وہ تین درجوں میں ہے اور مَیں دو درجوں کو محفوظ رکھ کر ابتدائی درجے کی بات کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ دونوں نے صحیح کہا کیونکہ قانُونِ الٰہی بھی یہی ہے کہ جب بھی وحی ہوتی ہے تو وہ کسی نبی یا ولی کی زبان اور آواز سے ہُوا کرتی ہے، کیونکہ خُدا بیچون اور بے مثال ہے، اس کے معنی یہ ہُوئے کہ ہر بڑے پیغمبر کو اس کے وزیر کی آواز میں آسمانی ہدایت مِلتی ہے۔

دُنیا کے تمام مذاہب والے اس بات کو مانتے ہیں کہ شیطان انسان کے نفسِ امارہ میں بُری باتیں ڈالتا ہے، تو کیا یہ خُدا کے عدل وانصاف کے خلاف ہے جو ہم مانیں کہ ہادیٔ برحق انسان کی عقل میں اچھی اچھی باتیں ڈال سکتا ہے، کیونکہ اگر شیطان کو یہ طاقت پروردگار کی جانب سے ہے تو پیغمبر اور امام کو اس سے کہیں زیادہ خیر کی طاقت حاصل ہونی چاہئے، نیز اگر دنیا کے گوشہ گوشہ میں شیطان جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ ہر مقام پر شیطان کا لشکر بھی ہے تو یقین کرنا ہوگا کہ ہادیٔ زمان بھی ہر جگہ پہنچ سکتا ہے کہ اس کا بھی حُجتہ ابداعیہ ہے اور اس کے بھی فلکی جسم میں لشکر ہیں جو ہدایت کے کام پر مامور ہیں، اور وہ حدودِ دین ہیں۔

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

آج کل ٹیلی پیتھی (TELEPATHY) کے لئے کوشش کی جاری ہے اور یہ ایک دن ضرور کامیاب ہوگی، اور اس وقت یہ چیز مذہب اور سائنس میں مشترک شمار ہوگی، پھر جو لوگ ہوشیار ہیں وہ سمجھ جائیں گے کہ انبیاء و اولیاء میں یہ چیز ہمیشہ سے موجود تھی۔

یہ آپ کے سوال کا مفصّل جواب ہے جس میں آپ نے پوچھا تھا کہ زمانۂ قدیم میں جبکہ آج کی طرح مواصلات کے ذرائع نہ تھے، اگر کوئی پیغمبر کسی مُلک میں آیا تو اس کی ہدایت سے پُوری دُنیا کو کس طرح خبر ہو سکتی تھی، جواب میں کہا گیا کہ اس پیغمبر کے تحت پُوری دُنیا میں حُدودِ دین کا جال بچھا ہُوا ہوتا تھا، جو کہ لوگوں کی سمجھ کے مطابق ہدایت کیا کرتے تھے اور حُدودِ دین کو ہدایت کے مرکز سے رُوحانی تعلیم ملتی تھی وغیرہ۔ اِس بیان میں حقیقی مومنین کے لئے بہت سی حکمتیں ہیں۔

طریقِ عبادت:-

سوال ۲۳ : میں علّامہ صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمیں طریقِ عبادت کے موضوع پر لیکچر دیں۔

جواب : سوال ۱۷ کے جواب کو دیکھیں۔

بچّوں کی پیدائش کا مسئلہ:-

سوال ۲۴ : اس دُنیا کا خاتمہ کس طرح ہو سکتا ہے جبکہ ہر منٹ

میں ہزاروں بچے پیدا ہوتے ہیں؟

جواب: میرے عزیز! آپ کا مسئلہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے اور منطق بھی بہت ہی عجیب، کسی نے کہا ہوگا کہ دُنیا ختم ہونے والی ہے، اور آپ کو خیال آیا کہ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا حشر ہوگا جو منٹ منٹ پر ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، گویا آپ کے نزدیک بچوں کی پیدائش ہی اِس جہان کے قیام و بقا کی ضمانت ہے، مطلب یہی ہے نا!

میرے پیارے! تُم کتنے نیک اور سادہ لوح ہو، تمہاری سادگی سے قربان جاؤں، یہ لو تمہارے سوال کے لئے بھی ایک سادہ جواب موجود ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ تمہاری اِس سادہ لوحی میں بھی علم آتا ہے، چنانچہ سورۂ حج (جو ۲۲ نمبر کا سورہ ہے)، کی آیت ۵۵ میں اشارہ ہے کہ قیامت البتہ پوشیدہ پوشیدہ آئے گی مگر آگے چل کر اس کے کئی نتائج ظاہر ہوں گے اس میں سے ایک تو یہ ہے کہ ایک زمانے میں سب عورتیں بانجھ ہو جائیں گی اور کسی کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوگا، اُس زمانے کو قرآن نے "یومِ عقیم" کہا ہے، یعنی بانجھ پن کا دِن، اَب شکر کرو کہ اگر دُنیا کا خاتمہ ہُوا تو اُس وقت چھوٹے بچے سامنے نہیں ہوں گے۔

حضرتِ عیسٰےؑ:-

سوال ۲۵: کیا حضرتِ عیسٰےؑ کو سولی دی گئی تھی یا نہیں؟ قرآن سے ثبوت چاہئے، نُور کہاں سے آیا ہے؟

جواب: حضرتِ عیسٰے علیہ السّلام کے بارے میں میرا ایک مقالہ

ہے جو پنج مقالہ ۲ میں چھپ گیا ہے، آپ اس کو دیکھیں، ہمارا اصُول یہ ہے کہ اگر کسی سوال کا جواب ہمارے پاس لکھا ہُوا موجود ہے تو دوبارہ نہیں لکھتے ہیں، بوقتِ ضرورت صرف حوالہ دیتے ہیں، تاہم بطریقِ مختصر یہاں بھی کچھ اہم باتیں بتائی جاتی ہیں کہ اگر خُدا تعالیٰ اپنے دوستوں کو، جو انبیاؑ و اولیاؑ ہیں دُنیا کی سخت ترین مصیبتوں میں صبر و ثبات سے کام لینے اور اعلائے حق کے لئے خود کو قربان کر دینے کی ہمّت دینے کی بجائے میدانِ مقابلہ سے بھاگ جانے کا ذریعہ مہیّا کرے تو پھر جذبۂ قربانی اور ذوقِ شہادت کا وجود ہی نہ رہے گا، اور راہِ خُدا میں کوئی شخص تکلیف اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہوگا، اس منطق سے ظاہر ہے کہ حضرتِ عیسٰےؑ کا مبارک جسم دین کی خاطر قربان ہوگیا تھا۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ان شہیدوں کو جو راہِ خُدا میں قتل کئے گئے ہیں زندہ قرار دیتا ہے (۳/۱۶۹) اور کچھ لوگوں کو جو زندہ ہیں مُردہ قرار دیتا ہے (۱۶/۲۱) کیا ایسے واقعات کے دو دو پہلو نہیں ہیں، کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ شہید جسم کے اعتبار سے مر تو جاتے ہیں مگر رُوح کے لحاظ سے زندہ ہیں، اور جو لوگ زندہ ہونے کے باوجُود خُدا کی نظر میں مُردہ شمار ہُوئے ہیں وہ جسمانی طور پر زندہ تو ہیں مگر رُوحانیت میں مرے ہُوئے ہیں، پس جاننا چاہیئے کہ حضرتِ عیسٰے علیہ السّلام کو جسمانیت میں سولی دے کر شہید کیا گیا تھا، مگر رُوحانیت میں خُدا کے حضور وہ زندہ تھے، کیونکہ وہ رُوح اللہ تھے اور تمام انبیاء و اولیاؑ ایسے ہیں پھر خُدا کی رُوح کو کون کیا کر سکتا ہے، حضرتِ عیسٰےؑ سے متعلق قرآنی آیتوں کا خلاصہ یہی ہے آپ مزید تفصیلات کے لئے اس مقالہ کو دیکھیں جس کا ذکر ہُو چکا ہے۔

اس سوال کے آخر میں یہ بھی پُوچھا گیا تھا کہ نُور کہاں سے آیا؟ اِس سوال کے پس منظر میں یہ تصوّر ہے کہ نُور اَب جس مقام پر ہے گویا اس مقام پر

وہ پہلے موجود نہیں تھا، حالانکہ یہ بات دُرست نہیں ہے، کیونکہ نُور ہمیشہ ایک شان سے ہے، جیساکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ کائنات و موجودات کا نُور ہے" (۳۵/۲۴)۔

۱۔ اگر اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین (یعنی کائنات و موجودات) کا نُور ہے تو اس کے معنی یہ ہیں، کہ یہ پُوری کائنات اور یہ ساری موجودات جو آج ہیں وہ سب ازل میں اپنی نُورانی شکل و صورت میں خُدا کے نُور کے سمندر میں ڈوبی ہُوئی تھیں، جن کو خُدا تعالیٰ نے مادّی وجُود میں ظاہر کیا۔

۲۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ عالمگیر رُوح ایک ایسی روشنی ہے جو کائنات و موجودات کی رُوحانی تحلیل سے ظہور پذیر ہو جاتی ہے، اور یہ حقیقت متعلقہ آیت کی تشریح سے باہر نہیں ہے۔

(۱۰۰) سو سوال

حصّہ دُوم

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

This Page Intentionally Left Blank

فہرستِ عنوانات "سوسوال" حِصّۂ دوم

سوال نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
-	حرفِ آغاز	۵۳
۲۶	ظہوراتِ رُوح	۵۷
۲۷	بنی آدم	۵۹
۲۸	حضرتِ خضرؑ	۶۰
۲۹	نبوّت اور امامت	۶۲
۳۰	حضرتِ حسنؑ	۶۳
۳۱	وارثِ رسُولؐ	۶۴
۳۲	امام اسماعیلؑ	۶۵
۳۳	رُوحانی ترقّی	۶۸
۳۴	حضرتِ آدمؑ	۶۹
۳۵	ترمیم و تجدید	۶۹
۳۶	شرائط و آدابِ عبادت	۷۱
۳۷	نُورانیت کا وقت	۷۲
۳۸	توحید	۷۳
۳۹	تصویر	۷۵
۴۰	مقصدِ تخلیق	۷۶

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

صفحہ نمبر	عنوان	سوال نمبر
۷۷	قیامت اور آخرت	۴۱
۷۹	تبدّلِ اجسام	۴۲
۸۱	کتابِ ناطق اور کتابِ صامت	۴۳
۸۲	اسمِ اعظم اور نبوّت	۴۴
۸۵	دو کیوں؟	۴۵
۸۶	مجالسِ دینی	۴۶
۸۷	خودی یا اَنا	۴۷
۸۸	اختیار اور مقدّر	۴۸
۹۰	صلوات	۴۹
۹۱	حاضر امامؑ	۵۰

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

پروردگارِ عالم کے اُس بابرکت اور مقدس بزرگ نام سے جو زندہ و گوینده ہے، جو علم و حکمت اور رُشد و ہدایت کا سرچشمہ اور توفیق و تائید کا ذریعہ ہے، جس کو کماحقہٗ یاد کرنے سے قلبی سُکون اور رُوحانی راحت حاصل ہوتی ہے اور جس میں عین الیقین کا نُور اور حق الیقین کا مرتبہ پنہان ہے۔

"سو سوال حصّۂ دوم" کی تمہید لکھتے ہُوئے دل میں مُسرّت و شادمانی اور شُکر گزاری کے گوناگون جذبات اُبھر رہے ہیں، یہ شاید اس لئے کہ ہماری حقیر سی ہستی کی طرف سے جو کوشش ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے، مگر خُداوندِ برحق کے احسانات و انعامات بہت ہی عظیم ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے "سو سوال" کی کتاب بہت بڑی اہمیّت و افادیت والی ثابت ہوگی، کیونکہ اِس میں عظیم کنیڈا کی ہماری عظیم جماعت کے خاص خاص سوالات کے لئے تسلّی بخش جوابات درج ہُوئے ہیں۔

آپ پر یہ حقیقت روشن ہے کہ انفرادی سوال آسان بھی ہو سکتا ہے اور مشکل بھی، مگر اجتماعی سوال ہر حالت میں مشکل ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ غور و فکر کے بہت سے مراحل سے گُزر کر سامنے آتا ہے، تاہم امامِ برحقؑ کے توسط سے پروردگارِ عالم سے جو توفیق و تائید حاصل ہوتی ہے وہ بہت بڑی چیز ہُوا کرتی ہے۔

یہاں سوال ہے کہ سوال کب اور کس موقع پر پیدا ہوتا ہے؟ یا کیونکر

پیدا ہوتا ہے ؟ سوال اُس وقت اُٹھتا ہے جبکہ علم و حکمت کے راستے میں چلتے چلتے کوئی رکاوٹ سامنے آئے، یا مذہب اور امام کی شناخت کے سلسلے میں کوئی شک پیدا ہو، یا کسی بحث کے نتیجے پر اس کی ضرورت محسوس ہوئی ہو، بہرحال ظاہر ہے کہ سوال کا جواب دانشمند کے نزدیک ضروری ہوا کرتا ہے، اور اس کے بغیر علم و دانش کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور نہ ہی علمی طور پر کسی کی مدد ہو سکتی ہے۔

اپنوں کو اور دوسروں کو علم پیش کرنے کے بہت سے طریقے ہیں لیکن سب سے منظّم طریقہ یہی ہے کہ سوال و جواب کے اُصول سے کام لیا جائے، تاکہ علم کے ضروری پہلوؤں سے بحث ہو اور مطلوبہ باتیں آسانی سے ذہن نشین ہو جائیں۔

یہ کتنی اچھی بات ہے کہ ہم اپنے علمی مسائل کو خود ہی آپس میں سوال و جواب کے ذریعے سے حل کریں بجائے اس کے کہ یہی سوالات دوسرے لوگ ہم سے پوچھا کریں اور ہم ان کی بحثوں میں پڑیں۔

انشاءاللہ تعالیٰ "سو سوال" کی کتاب، جو چار الگ الگ حصّوں میں شائع ہو رہی ہے، بہت ہی سُودمند اور مُفید ثابت ہوگی، خصوصاً اُس وقت جبکہ اس کے ترجمے ہوں۔

اگر میں اس موقع پر خانۂ حکمت کے ہوشمند عملداروں اور سرگرم اراکین کے ذکرِ جمیل کو پسِ پُشت ڈالوں تو یہ میری ایک ناشکری اور احسان فراموشی ہوگی، ظاہر بات ہے کہ علم کو کتابی شکل دے کر منظرِ عام پر لانے کے سلسلے میں بہت سی مشکلیں سامنے آتی ہیں، جن پر قابو پانے کے لئے ایک ایسی منظّم جمعیّت کی ضرورت ہے، جس کے افراد میں گوناگون قوتیں

اور طرح طرح کی صلاحیتیں پائی جاتی ہوں، الحمدللہ خانۂ حکمت کے اراکین میں یہ تمام صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

حق بات تو یہ ہے کہ ہمارے عزیزوں کی جمعیّت علم کی اشاعت کے لئے بہت کُچھ جدوجہد کر رہی ہے اور اس کا نتیجہ تسلّی بخش ہے اور اِنشاء اللہ اِس نیک کام میں مزید ترقّی کی اُمید ہے۔

جہاں علمی خدمت کا کوئی ذکر آئے وہاں جانِ عزیز ڈاکٹر فقیر محمّد صاحب ہونزائی کا پُرلطف تذکرہ ضرور ہونا چاہیئے، اس کے بغیر نہ مجھے کوئی مزہ آتا ہے اور نہ میرے عزیزوں کو، جب میں موصوف کا نامِ گرامی لیتا ہُوں تو اس سے میری مُراد ایک علمی دُنیا ہوتی ہے، جس میں علم وحکمت کی ہر شئی کے علاوہ مشرق و مغرب کے بہت سے علم دوست افراد سموئے ہُوئے ہوتے ہیں، چُنانچہ میں جانِ عزیز کے وسیلے سے سب عزیزوں کو یاد کرتا ہُوں۔

مَیں یہاں ان حضرات، احباب اور عزیزدل کو بھی یاد کرتا ہُوں جو پاکستان کے مختلف شہروں میں رہتے ہیں اور جو شمالی علاقہ جات میں بستے ہیں، جن کو میری کتابوں سے دلچسپی ہے، جن کے علمی ذوق وشوق کو دیکھ کر مجُھے کام کا حوصلہ ملتا ہے، جو علم دوستی اور قدردانی جیسے اوصاف سے موصوف ہیں اور جو جان ودل سے علم کی روشنی پھیلانے کے خواہشمند ہیں۔

کاش کہ میں بہترین الفاظ میں کینیڈا کی نیک نام جماعت کا پُرخلوص شکریہ جیسا کہ چاہیئے ادا کر سکتا، کہ اُنہوں نے اِس حقیر شخص میں امامِ عالی قدر کے رُوحانی علم پر اعتماد کرتے ہُوئے ضروری سوالات کئے ورنہ " سو سوال" جیسی اہم کتاب عرصۂ وجود میں نمودار نہ ہوتی صرف یہی نہیں بلکہ اِس عظیم جماعت کے وسیلے سے ہمارا دائرۂ کار مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل چُکا ہے، جس

کے لئے میں خصوصاً کینیڈا کے دوستوں اور عزیزوں کا شکرگزار اور ممنون ہوں۔

آخر میں عاجزانہ دُعا ہے کہ خُداوندِ عالم رُوحانی علم کی خدمت کرنے والوں کو اور اس علم سے دلچسپی رکھنے والوں کو دونوں جہان کی سلامتی اور کامیابی عطا فرمائے! ربّ العزت ان جان نثار مومنین سے ہمیشہ راضی ہو! جو دینی علم کے فروغ و ترقی کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں دیتے رہتے ہیں! آمین یارب العٰلمین!!

فقط بندۂ عاجز

نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی

بروزِ جُمعہ ۲۸، شعبان ۱۳۹۸ھ

۴، اگست ۱۹۷۸ء

سالِ اسپ

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ظہوراتِ رُوح :-

سَوال ۲۶ : رُوح کے دُنیا میں بار بار آنے کے بارے میں اسمٰعیلیت کا کیا عقیدہ ہے؟ کیا رُوح کے ہمیشہ مختلف ظہورات ہوتے رہتے ہیں؟

جَوابُ : اِس سلسلے میں سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ دینِ اسلام شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کا مجمُوعہ ہے، چُنانچہ زمانۂ رسُولؐ سے لے کر قیامت تک جتنا لمبا دَور ہے وہ اسلام کے ان چاروں درجوں پر تقسیم ہے لہٰذا سب سے پہلے شریعت پر زور دیا جاتا ہے، اس کے بعد سب نہیں تو کچھ لوگ طریقت میں داخل ہو جاتے ہیں، تھوڑے سے لوگ حقیقت میں بھی پہنچ جاتے ہیں، اور معرفت تک بہت ہی کم لوگ رسا ہو جاتے ہیں، اس کے یہ معنی ہُوئے کہ اسلام کی ظاہری تعلیمات پہلے آتی ہیں اور باطنی تعلیمات بعد میں، چُنانچہ باطنی تعلیمات (یعنی حقیقت اور معرفت) کے مطابق رُوح دُنیا میں بار بار آتی رہتی ہے، مگر رُوح کے بارے میں یہ سوال کافی نہیں ہے، کیونکہ ابھی یہ جاننا باقی ہے کہ کیُوں آتی ہے؟ اور کب آتی ہے؟ کس طرح آتی ہے؟ ناکامی کی صُورت میں آتی ہے؟ یا کامیابی کی صُورت میں یا دونوں طرح سے؟ پھر فرق کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

۱۔ اگر رُوح کا دُنیا میں ظاہر ہو جانا رحمت ہے تو یہ رحمت بار بار کیوں نہ ہو، رحمتِ خُداوندی تو لا انتہا ہوتی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے وجود و بقا کا تصوّر ایک دائرے کی طرح دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہر چیز ایک دائرے پر گردش کرتی رہتی ہے۔

۳۔ پیغمبرؐ کا ارشاد ہے کہ تمام اُمّتوں کے مومنین بھائی بھائی ہیں اور تمام انبیاء ایک جان کی طرح ہیں۔ اگر سارے پیغمبر ایک جان کی طرح ہیں تو ان سب کا دنیا میں آنا ایک پیغمبر کے بہت سے ظہورات کی طرح ہیں، پس حقیقت کی رُو سے یہ کیوں نہ کہیں کہ اگر تمام انبیاء ایک جان کی طرح ایک ہیں تو ان کے وہ سارے ظہورات دراصل نورِ محمدی کے تھے اور اماموں کی صورت میں بھی اسی ایک نُور کے مختلف ظہورات ہیں، پس معلوم ہُوا کہ رُوح کے بھی ظہورات ہوتے رہتے ہیں۔

۴۔ ہمارے تمام مسائل قرآنی حکمت ہی سے حل ہو سکتے ہیں، چُنانچہ حکمت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کائنات کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے اور خُدا نے لوگوں کو اسی فطرت کے مطابق پیدا کیا ہے اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کائنات کی اور اس کے اندر جتنی چیزیں ہیں ان سب کی شکل اور چال یعنی گردش گول ہے اور اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اپنی شکل وصورت سے یا رفتار سے دائمی گردش کو ظاہر نہ کرتی ہو، مثلاً آسمان، سورج، چاند، سیّارے، ستارے، ہوا، پانی، زمین وغیرہ اس سے ظاہر ہے کہ انسان بھی آتا جاتا رہتا ہے، مگر فرض کرو کہ سولاکھ سولاکھ سولاکھ (تین کروڑ) برس میں جانا ہے اور سولاکھ سولاکھ سولاکھ (تین کروڑ) برس میں آنا ہے، اور پُورے دائرے کی مسافت چھ کروڑ برس کی ہے۔

اس کے علاوہ سوال ۱ اور ۲ کے جواب کو بھی پڑھیں، تاکہ مطلب خُوب ذہن نشین ہو جائے۔

بنی آدم:-

سوال ۲۷ : کیا سارے انسان آدم و حوّا سے ہیں یا یہ کسی ایسے ارتقاء کی پیداوار ہیں، جیسا کہ مولائے رُومیؒ نے اس کا تصور پیش کیا ہے کہ جمادات کی ترقّی سے نباتات بن گئیں اور نباتات سے حیوانات بن گئے پھر انسان؟

جواب : اس سوال میں ڈارون اور مولائے رُومیؒ کے دو الگ الگ نظریوں کو خلط ملط کر کے پیش کیا گیا ہے، حالانکہ مولانا رومیؒ کا نظریہ وہی ہے جو اسلام کا ہے اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں، کہنا یُوں ہے کہ رُومیؒ نے کب کہا ہے کہ دُنیا کے انسان حضرت آدم کی اولاد نہیں ہیں؟ آپ ان کی کتابوں کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا۔

رُومیؒ نے جو کُچھ کہا ہے اور جس طرح سے کہا ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، مولائے رُومیؒ نے قرآنِ حکیم کی روشنی میں انسانی تخلیق کے مختلف درجات کا ذکر کیا ہے، چُنانچہ قرآن میں جگہ جگہ اِنسان کو مٹّی سے پیدا کئے جانے کا ذکر موجود ہے، اور مٹی جمادات میں سے ہے، پھر ارشاد ہے کہ خُدا نے تم کو زمین سے نباتات کی شکل میں اُگایا ہے (۱۷/۷۱) نیز قرآن میں یہ بھی ہے کہ انسان حلال جانور کے دُودھ کو پیتا ہے اور گوشت کو کھاتا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ جمادات، نباتات اور حیوانات سے انسان کی شخصیت بنتی ہے اور حیوانی رُوح بنتی ہے، مولائے رُومیؒ نے انہی معنوں میں اپنے متعلق کہا ہے کہ وہ پہلے جمادات تھے، پھر نباتات ہو گئے بعد ازاں حیوان میں آگئے،

اس کے بعد انسان میں بدل گئے اور جس معنیٰ میں اِنسان آدم کی اولاد ہیں وہ یہ ہے کہ آدمیت اور انسانیت کی رُوح آدم و حوّا سے چلی آئی ہے اور وہ پشت بہ پشت چلتی رہی ہے۔

اِنسانی تخلیق کے مختلف اعتبارات کیوں ہیں ؟

اس لئے کہ انسانی وجود بہت سے عناصر سے مکمل ہو جاتا ہے بلکہ یُوں کہنا چاہئے کہ انسان پُوری کائنات و موجودات کا خلاصہ ہے، کیونکہ انسان کئی کئی تخلیقوں کے بعد مکمل ہو گیا ہے اور اس میں ہر چیز موجود ہے۔

سوال ۲۷ کے جواب کو بھی پیشِ نظر رکھو اور غور سے پڑھو تاکہ مطلب واضح ہو سکے۔

حضرتِ خضرؑ :-

سوال ۲۸ : حضرتِ خضرؑ کون ہے اور دُنیا میں اس کی دائمی موجودگی کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے ؟

جواب : حضرتِ خضر علیہ السّلام اپنے وقت میں ایک پیغمبر تھا، اور وقت آنے پر دُنیا سے رحلت کر گیا، مگر کسی نہ کسی طرح سے یہ ایک روایت بن گئی کہ خضر پیغمبرؑ نے آبِ حیات پی لیا تھا، لہٰذا وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے، اِس سلسلے میں لوگوں کو گمان تھا کہ دُنیا کے کسی گوشے میں ظلمات (تاریکیاں) کے نام سے ایک مقام ہے، جہاں آبِ حیات کا چشمہ پایا جاتا ہے، جس کو اگر کوئی آدم زندگی میں ایک بار پی سکتا ہے، تو وہ کبھی نہیں مرتا بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا ہے، کہتے ہیں کہ اسکندر نے آبِ

حیات حاصل کرنے کے لئے کوشش کی تھی، مگر وہ کامیاب نہیں ہُوا، اِن ساری باتوں کی بنیاد کہانی پر قائم کی گئی ہیں نہ کہ حقیقت پر۔

مگر یہ بات درست ہے کہ اِس مشہور روایت سے مثال کا کام لے کر اکثر دفعہ تاویل پیش کی گئی ہے، چُنانچہ ظلمات کی تاویل ہے جہالت و نادانی، کیونکہ معرفت اسی میں پوشیدہ ہُوا کرتی ہے، آبِ حیات سے معرفت مُراد ہے اور خضرؑ کے معنی ہیں ہادیٔ برحق جو ہر وقت دُنیا میں حاضر ہے، چونکہ معرفت سے کے آبِ زندگانی کا رہنما وہی ہے، اور معرفت ہی حقیقی معنوں میں آبِ حیات ہے، جس کے حصول سے مومن رُوحانی طور پر زندۂ جاوید ہو جاتا ہے نہ کہ جسمانی طور پر۔

قرآنِ حکیم سختی کے ساتھ اِس بات کی تردید کرتا ہے کہ کوئی نفس موت کا مزہ نہ چکھے (۲۹/۵۷) اور کوئی جسم آنحضرتؐ سے قبل ہمیشہ کے لئے زندہ رہے (۲۱/۳۴)، پھر کس طرح حضرتِ خضرؑ اور حضرتِ عیسےٰؑ یا اور کوئی جسمانی طور پر ہمیشہ کے لئے زندہ رہ سکتا ہے۔

آج کل سائنس اور ٹیکنالوجی نے دین کی حقیقتیں سمجھنے کے لئے بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں، چُنانچہ ظاہر ہے کہ اِس سیارۂ زمین پر کہیں کوئی ایسا آبِ حیات نہیں پایا جاتا کہ جس کے پینے سے انسان ہمیشہ کے لئے جسمانی طور پر زندہ رہ سکے، پھر حضرتِ خضرؑ کی جسمانی زندگی کی روایت بغیر تاویل کے کس طرح دُرست ثابت ہو سکتی ہے۔

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

نبوّت اور امامت :-

سوال ۲۹ : کسی پیغمبر اور امام کے درمیان کیا فرق ہوتا ہے؟
جواب : نبوّت اور امامت ایک ہی حقیقت کے دو پہلو یا کہ ایک ہی نور کے دو رُخ ہیں لہٰذا باطن میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں، مگر ظاہر میں فرق ہے، اور وہ بھی ہمیشہ نہیں بعض دفعہ، جس کی وضاحت یہ ہے کہ زمانہ دو حصّوں میں منقسم ہے ایک دَورِ نبوّت ہے اور دوسرا دَورِ امامت چنانچہ اگر نبوّت کا دَور ہے تو امام بعض دفعہ کسی نمایاں پیغمبر کی حیثیت سے بھی ہو سکتا ہے، بعض اوقات کسی ایسے پیغمبر کی شخصیت میں بھی جس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور بعض مرتبہ کسی مخفی کامل انسان کی صورت میں بھی، اور اگر امامت کا دَور ہے تو امامِ عالی مقام حضرتِ پیغمبرؐ کا جانشین ہوا کرتا ہے، جیسا کہ اس زمانے میں ہے اس کے یہ معنی ہُوتے کہ دَورِ نبوّت میں امامت کا مرتبہ بحیثیتِ مجموعی پوشیدہ رہتا ہے اور دَورِ امامت میں یہ مرتبہ آشکار ہو جاتا ہے۔

پیغمبرؐ کا دائمی معجزہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آسمانی کتاب کو حاصل کرتا ہے اور اس کی تنزیل بیان کرتا ہے اور امام کا معجزہ یہ ہے کہ وہ اس کتاب کی رُوحانیت و تاویل سکھاتا ہے، رسولؐ اپنے وقت میں صرف انہی لوگوں کی ہدایت فرماتا ہے جو اقرارِ نبوّت کے دائرے میں داخل ہیں اور آئندہ ہدایت امام کے سپرد کر دیتا ہے، اور امام صرف انہی لوگوں کی ہدایت کرتا ہے جو اقرارِ امامت کے دائرے میں آچکے ہیں۔

پیغمبرؐ نے جس طرح ایک ایسی پُرحکمت کتاب لائی کہ اس کے ظاہر و باطن میں شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی تعلیمات موجود ہیں، امامِ عالی مقامؑ اسی طرح زمانے کی ترقی و تبدیلی کے ساتھ ساتھ قرآن اور اسلام کی ان تعلیمات میں لوگوں کو آگے بڑھاتا ہے اور صراطِ مستقیم پر منزل بمنزل ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

حضرتِ حسنؑ:-

سوال ۳۰: یہ تو مسلّمہ ہی ہے کہ حضرتِ حسنؑ پنجتن پاک کا ایک رُکن ہیں اور اس کے علاوہ اسماعیلی نقطۂ نگاہ سے حضرتِ حسنؑ کا کیا درجہ ہے؟

جواب: جیسا کہ سوال ۸ کے جواب میں اس کا مفصّل ذکر گزرا اور سوال ۳۲ کے جواب میں بھی اس کا مختصر ذکر کیا گیا ہے کہ حضرتِ حسن علیہ السّلام امام تھا، مگر امامِ مستودع، کیونکہ نُورِ امامت زمان و مکان کے تقاضے کے مطابق مختلف درجات میں ظہور پذیر ہوتا ہے، مثلاً امامِ مقیم، امامِ اساس، امامِ مُتم، امامِ مستقر اور امامِ مستودع (دیکھو کتاب الامامۃ فی الاسلام صفحہ ۱۴۳)۔

امامِ مستودع امامِ مستقر کے علاوہ ہوتا ہے، جس کی امامت ایک پُشت یا چند پُشتوں کے بعد امامِ مستقر میں لوٹ جاتی ہے، چنانچہ حضرتِ ابراہیمؑ کے بعد حضرتِ اسماعیلؑ امامِ مستقر تھا اور حضرت اسحاقؑ امامِ مستودع، جس کی امامت کئی پُشتوں کے بعد آنحضرتؐ کے زمانے میں مستقر کی طرف لوٹ آئی تھی (ملاحظہ ہوں مذکورہ کتاب کے

صفحات ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۳، اور ۱۵۵)۔

وارثِ رسولؐ :-

سوال ۳۱ : اگر اہلِ سُنّت واقعۂ غدیرِ خم سے انکار کریں تو کس طرح کوئی شیعہ یہ ثابت کر سکتا ہے کہ حضرتِ علیؑ ہی رسُول کے حقیقی وارث اور حقدار جانشین تھے؟

جواب : یہ مسئلہ کوئی نیا تو نہیں، اِس بُنیادی اہم موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، لہٰذا آپ خود ان کتابوں کا غور و فکر سے مطالعہ کریں، تاہم آپ کی فوری خواہش کے پیشِ نظر یہاں پر بھی کچھ وضاحت کی جاتی ہے کہ :-

(الف) وارثِ رسُولؐ امام علی و ائمۂ اولادِ علی علیہم السّلام ہی ہیں، جن کو بموجبِ ارشادِ قرآنی (۳۲/۳۵) اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتاب کی وراثت کے لئے برگزیدہ فرمایا ہے، تاکہ وہ آنحضرتؐ کے بعد اِس ربّانی منشاء کا عملی نمونہ بن کر دُنیا میں ہمیشہ حیّ و حاضر رہیں، اور حقدار مسلمین و مومنین کی بجا طور پر ہدایت و رہنمائی کریں۔

(ب) آپ نے سوال میں اتفاقاً لفظ "انکار" کو استعمال کیا ہے، جس کی مُراد یہاں محکم دلائل کو قبول نہ کرنا ہے، اور یہ ایک ایسی منطق ہے کہ اِس سے آپ کا سوال خود بخود ختم ہو جاتا ہے، اور مزید پُوچھنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

(ج) اولادِ علیؑ کے ائمۂ اطہار علیہم السّلام کے سلسلۂ امامت و ہدایت کا اسی طرح جاری و باقی رہنا جس طرح کہ شروع سے اب تک چلے آیا ہے خود اِس

حقیقت کا سب سے عظیم اور سب سے روشن ثبوت ہے کہ اہلِ بیتِ رسول ہی آنحضرتؐ کے حقیقی وارث ہیں اور اِس پاک آسمانی وراثت کے حقدار یہی حضرات ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا مقصد ہی یہی ہے کہ دین میں ہمیشہ کے لئے نظامِ ہدایت اسی طرح قائم رہے جس طرح پیغمبرِ اکرمؐ کے زمانے میں تھا۔

(د) علیؑ وائمۂ اولادِ علیؑ کے سوا اور کون سا سلسلہ ہے جو حبل اللہ کا مثول ہو سکے، کہ خُدا کی رسّی کبھی ٹوٹتی نہیں (۳/۱۰۳) خُدا کا نُور کہلائے کہ وہ ہرگز نہیں بُجھتا (۸/۶۱) ایک پاک سدا بہار درخت کی طرح ہمیشہ اور ہر موسم میں پھل دیتا رہے کہ اس کی جڑ مضبوط اور شاخ آسمان میں جالگی ہے (۱۴/۲۵ - ۲۴) ولیٔ امر کی حیثیت سے خُدا اور رسولؐ کی نمائندگی کرے کہ دینی ہدایت کا مرکز ہمیشہ قائم رہتا ہے (۴/۵۹) اور اس کے وسیلے سے آلِ ابراہیمؑ اور آلِ مُحمّدؐ کی عظمت و بزرگی برقرار رہے کیونکہ آسمانی کتاب و حکمت اور مُلکِ عظیم (رُوحانی سلطنت) کی میراث کی فضیلت قیامت تک صرف اسی خاندان کو حاصل ہے (۴/۵۴)۔

امام اسماعیلؑ :-

سوال ۳۲ : فلان کتاب کے فلان صفحے پر مصنّف نے لکھا ہے کہ امام اسماعیلؑ اپنے پدرِ بزرگوار امام جعفر الصادق کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے، اور جناب موسیٰ کاظم حقیقی جانشین تھے، کیا آپ کچھ جوابی دلائل سے ہمیں یہ ثبوت مہیّا کر دیں گے کہ امام جعفر الصادق کے بعد امام اسماعیل زندہ تھے، اور امامت کے حقیقی وارث بھی وہی تھے؟

جواب : مخالفانہ قِسم کی کتابوں کو اہمیّت دینا بہت بڑی کمزوری

ہے، لیکن جاننے کے لئے سوال کرنا ضروری ہے سوجاننا چاہئے کہ قانون دین کا ہو یا دنیا کا، اس میں ہمیشہ یہی ہُوا کرتا ہے، کہ وہ ایک طرف سے ایسے عام اصولات کا مجموعہ ہوتا ہے جو وہ ہر وقت ایک جیسے رہتے ہیں، اور دُوسری طرف سے اس میں خصوصی واقعات اور مستثنیات کے لئے ہر وقت گنجائش بھی رہتی ہے، تاکہ بوقتِ ضرورت کوئی تنگی نہ ہو، چنانچہ کتابِ "وجہِ دین" حصۂ اوّل کلام ۱۰۱ صفحہ ۱۱۲ پر تحریر ہے کہ شاہ اسماعیلؑ کی امامت ان کے والد کی موجودگی ہی میں محمّد بن اسماعیلؑ میں منتقل ہوگئی تھی، جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ امام جعفر الصادقؑ نے وقت سے بہت پہلے اسماعیل کو امامت تفویض کردی تھی اور امام اسماعیلؑ نے بھی ایسا ہی کیا تھا، یعنی اُنھوں نے اپنے والدِ ماجد کی موجودگی ہی میں امامت اپنے بیٹے محمّد بن اسماعیل پر نص کردی تھی، اس سے وہ تاریخی سوال ختم ہوگیا کہ امام اسماعیل کا انتقال کب ہوا تھا؟ باپ کی زندگی میں یا بعد کے کسی وقت میں؟ کچھ بھی ہو، بہرحال امامت کا سلسلہ اسماعیلؑ کے ذریعے سے جاری تھا نہ ان کے بھائی کے وسیلے سے، اور آج تک جبکہ امامت حضرتِ امام اسماعیلؑ کی نسل میں سے چلی آئی ہے تو ماننا پڑے گا کہ امام اسماعیلؑ ہی حق پر تھے۔

یہ درست ہے کہ امامت اکثر دفعہ امام کی جسمانی زندگی کے آخری ایّام میں یا آخری لمحات میں منتقِل ہو جاتی ہے، یہ دراصل صرف اختیار کی منتقلی کی بات ہے، ورنہ یہ سچ ہے کہ ہونے والا امام رُوحانیت اور نُورانیت کی منزلیں بہت پہلے ہی طے کرلیتا ہے، کیونکہ نُور مادی چیز کی طرح ایسا نہیں کہ وہ صرف ایک ہی شخصیت میں محدود ہو، بلکہ وہ بیک وقت کئی شخصیّتوں میں موجود ہوسکتا ہے، چنانچہ پنجتن کی مثال لی جائے کہ نُور اُن پانچ حضرات میں سے کس میں تھا؟ سب میں نا، اختیار کس کو حاصل تھا؟ ایک کو، جو آنحضرتؐ تھے، اس سے

ظاہر ہے کہ نورِ امامت کی روشنی باپ کے علاوہ بیٹے اور پوتے میں بھی پہنچتی ہے، کیونکہ نور ایک دن میں منتقل نہیں ہو سکتا ہے اور جو چیز فوراً منتقل ہو سکتی ہے وہ دینی ہدایت کا اختیار ہے۔

قرآن میں یہ ذکر ہے کہ خدا کے نُور کو کوئی نہیں بُجھا سکتا لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ کبھی کسی پیغمبر کو اور کسی امام کو شہید نہیں کیا گیا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خُداوند تعالیٰ ایسا وقت آنے پر جس تدبیر سے اپنے نُور کو دُوسری شخصیت میں تبدیل کرتا ہے اس کے بھید ایسے ہیں کہ ان کو ہر شخص نہیں پا سکتا، چُنانچہ زمانے کے خطرات کے پیشِ نظر شاہ اسماعیلؑ کی امامت معجزانہ طور پر محمد بن اسماعیلؑ میں منتقل ہو گئی تھی۔

سیدنا قاضی نعمان کتاب "اساس التاویل" میں اور پیر ناصرِ خسروؒ کتاب "وجہِ دین" میں فرماتے ہیں کہ حضرتِ یعقوبؑ کی امامت بہت پہلے ہی حضرتِ یوسفؑ کو منتقل ہو گئی تھی، جس کی وجہ یوسفؑ کے بھائیوں کی دُشمنی تھی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ باپ کی نظرِ انتخاب ان کو چھوڑ کر یوسفؑ پر رہے۔

حضرتِ علیؑ کی شہادت سے پیشتر حضرتِ حسنؑ اور حضرتِ حُسینؑ میں نُورانیت اور امامت کی صلاحیت آچکی تھی، جس کے بارے میں پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "حسن اور حُسین دونوں امام ہیں خواہ وہ کھڑے ہو جائیں یا بیٹھیں اور ان کا والد ان سے بہتر ہے۔"

اسی طرح حضرتِ امام حُسینؑ کی شہادت سے پہلے، ہی امامت حضرتِ زین العابدین کو مل چُکی تھی، کیونکہ قدرت وقت کے تقاضا کے مطابق اپنا کام کرتی ہے، پس یہ حقیقت اور زیادہ روشن ہوئی کہ حضرتِ اسماعیلؑ کی امامت وُقت سے پہلے مُحمّد بن اسماعیلؑ میں منتقل ہُوئی تھی جس کا سبب اُوپر بتایا گیا۔

رُوحانی ترقّی۔

سوال ۳۳: رُوحانی ترقّی کی بُنیادی شرطیں کیا ہیں؟ اگر ایک مومن عرصۂ دراز سے باقاعدہ عبادت کرتا رہا ہے پھر بھی اس کی کوئی ترقی نہیں ہُوئی ہے تو ایسی پس ماندگی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

جواب: رُوحانی ترقی کی بُنیادی شرطیں امامِ زمانؑ کی حقیقی اور پُوری پُوری فرمانبرداری ہے، جو علم و عمل سے ہوسکتی ہے یعنی رُوحانی ترقی کی ایک بُنیادی شرط دینی علم ہے اور دوسری شرط نیک عمل ہے، دینی علم سے مُراد علم الیقین ہے، یعنی ایسا علم جس کے ذریعے سے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے اور سوالات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، اور عمل یعنی اعمال ایسے کہ وہ امامِ زمان کی مرضی کے مطابق ہوں، تاکہ رُوحانی ترقی ہوسکے۔

اگر مومن عرصۂ دراز تک باقاعدہ عبادت کرتا ہے تو اس کی رُوحانی ترقی ضرور ہوگی، لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ آپ نے ایسے مومن کو جس معیار سے پرکھ لیا ہے وہ بالکل عام معیار ہے، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ جس عبادت کو آپ باقاعدہ کہتے ہیں وہ پھر بھی باقاعدہ نہیں ہے، کیونکہ اس میں علم الیقین کی کمی ہے اور اعمال کی خامی ہے، نیز ممکن ہے کہ "ذکر" کے طریقِ کار میں بھی فرق ہو، آپ دیکھیں میری کتاب "ذکرِ الٰہی" کو جس کا اُردو سے انگلش میں ترجمہ جانِ عزیز ڈاکٹر فقیر محمد صاحب ہونزائی اور محترمہ زین رحیم قاسم نے کیا ہے۔

حضرتِ آدمؑ :-

سوال ۳۴ : آپ یہ بتائیں کہ دُنیا میں کتنے آدم ہو گزرے ہیں؟

جواب : اگر عام روایت اور ظاہری علم کو دیکھا جائے تو یوں لگے گا جیسا کہ صرف ایک ہی آدم اِس دُنیا میں آیا ہو، لیکن جب کسی حقیقی مومن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت دی جاتی ہے تو وہ جانتا ہے کہ تخلیقِ آدم کا مسئلہ اور اس کی حقیقت کیا ہے، وہ سمجھ لیتا ہے کہ آدم ایک نہیں کئی ہیں بلکہ لاتعداد ہیں، کیونکہ آدم سے وہ انسانِ کامل مُراد ہے، جس سے اِنسانیت اور مذہب کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے اور خُدا تعالیٰ کی بادشاہی میں، جو قدیم ہے، ہمیشہ ہمیشہ ایسے ادوار کا سلسلہ جاری ہے، جس کے معنی ہیں کہ اس وسیع وعریض کائنات میں ستارۂ زمین کی طرح بہت سی دُنیائیں بنتی اور مٹتی رہتی ہیں، اور ہر دُنیا کی عمر میں کئی کئی آدموں کے ادوار گزُرتے ہیں۔

ترمیم وتجدید :-

سوال ۳۵ : ہماری مُقدّس دُعا میں ترمیم وتجدید کیوں کی گئی؟ خصُوصًا یہ سوال بعض بُنیادی الفاظ کے بارے میں ہے؟

جواب : اِسلام دینِ فطرت ہے اِس لئے وہ اپنے ظاہر وباطن میں یہ گنجائش رکھتا ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور لوگوں کی

ضرورت کے پیشِ نظر اس میں مناسب ترمیمات کی جائیں، تاکہ سچے دین پر عمل کرنے میں لوگوں کو کوئی دشواری پیش نہ آئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا مقدس ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے وہ تم کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا (۲/۱۸۵)۔

خُداوندِ برحق کے اس پاک فرمان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مہربان یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ دین و مذہب کے معاملے میں کوئی غیر ضروری سختی اور دشواری لوگوں کے سامنے آئے، لہٰذا اُس نے اپنی بے پناہ رحمت سے ہادیٔ برحق کو امورِ دین میں یہ اختیار عنایت کر دیا ہے کہ جہاں اور جب ضرورت ہو وہ مناسب ترمیمات کر لیا کرے۔

اِس سلسلے میں یہ بحث بڑی مُفید ہے کہ دینِ حق یعنی اسلام کب سے ہے؟ حضرتؐ کے زمانے سے۔ بلکہ ازل سے، کیا یہ صحیح ہے کہ زمانۂ آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ کے عہدِ مبارک تک سچا دین (اسلام، جس طرح چلے آیا ہے اس کی بُنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ترمیمات ہوتی رہی ہیں؟ ہاں یہ حقیقت ہے، یہ ترمیمات کس طرح کی جاتی تھیں؟ وہ اس طرح کہ دین کے احکام دو قسم کے ہوتے ہیں ایک قسم میں ترمیم کی گنجائش ہوتی ہے اور دُوسری قسم میں نہیں ہوتی، پس جن احکام میں ترمیم و تجدید کی گنجائش ہے انہی میں ترمیم و تجدید کی جاتی ہے، دُوسری قسم کے احکام میں نہیں۔

کیسے پتا چلے کہ دین کی بعض چیزوں میں تبدیلی کا وقت آچکا ہے؟ نبوت کے دَور میں جب ایک پیغمبر کے بعد دُوسرا پیغمبر آتا ہے اور امامت کے دَور میں جب ایک امام کے بعد دُوسرا امام مقرر ہو جاتا ہے تو تب پتا چلتا

ہے کہ اب دین کی بعض باتوں میں رفتہ رفتہ ترمیمات ممکن ہیں، اور اِس اُصول میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی حکمتیں ہیں۔

شرائط و آدابِ عبادت :-

سَوال ۳۶ : عبادت اور ذکر کس طرح ہونا چاہیئے تاکہ کامیابی ہو؟

جَواب : (الف) بندۂ مخلص حقیقی محبّت کے جذبات سے سرشار ہوکر خاص و عام عبادت کرے تاکہ رُوحانی ترقّی ہو، قوم کی خیر خواہی اور خدمت لازمی شرط ہے۔

(ب) حقیقی مومن کو چاہیئے کہ صبح و شام گریہ وزاری کر کے عملی طور پر اپنے تمام گُناہوں سے توبہ کرے، کیونکہ اگر ذرا بھی گُناہ کا زنگ دل میں رہ گیا تو عبادت آگے نہیں بڑھتی ہے، دینی علم کے بغیر رُوحانی ترقّی ناممکن ہے۔

(ج) بندۂ مومن کو دائم الذّکر (یعنی ہمیشہ ذکر کرنے والا) ہونا چاہیئے تاکہ رفتہ رفتہ اس کا دل پاک ہو، اور عبادت کامیاب ہوجائے، تقویٰ بہت ضروری ہے۔

(د) اگر آپ خُصوصی عبادت کے وسیلے سے رُوحانی ترقّی کرنا چاہتے ہیں، تو رات کو وقت سے پہلے اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں خُوب مناجات اور گریہ وزاری کریں، نہایت ہی عاجزی سے بار بار سجدے میں جائیں اور دُعا مانگیں۔

(ہ) آپ مکمل طور پر پرہیز گار بنیں، یعنی دین کے اوامر پر عمل کریں اور نواہی سے باز رہیں، اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے حواسِ ظاہر اور

حواسِ باطن کو خُدا تعالیٰ کے امر و فرمان کے مطابق استعمال کریں۔

نوٹ: اِس سلسلے میں "ذکرِ الٰہی" (جو میری ایک کتاب ہے)، کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

نُورانیّت کا وقت:۔

سَوال ۳۷ : اسمِ اعظم کے ذکر کے لئے کسی اور وقت کی بجائے صبح چار بجے سے پانچ بجے تک کا وقت کیوں منتخب کیا گیا ہے؟

جَوابْ : یہ وقت اس لئے منتخب ہے کہ اس میں کم سے کم چار فضیلتیں ہیں؛

(۱) صبح کا یہ وقت رات کا آخری حصّہ ہے، اور رات پُر سکون و کامیاب عبادت کے لئے دن کے مقابلے میں زیادہ مناسب اور موزون ہے۔

(۲) صبح کا وقت شام کے وقت سے زیادہ بہتر ہے، کیونکہ ایک بار سو کر جاگنے سے مومن کا دل و دماغ عبادت کے لئے ہر طرح سے تازہ دم اور تیار ہو جاتا ہے۔

(۳) صبح سویرے جاگنے میں حقیقی دوست کی طرف سے امتحان ہے کہ مومن کس حد تک دیدار کا جذبہ رکھتا ہے۔

(۴) اس میں وقت کی بچت اور کام کی عمدگی کا فلسفہ بھی ہے کہ یہ خُصوصی عبادت رات کے آخری کنارے پر رکھی جائے تاکہ یہ عام عبادت سے قریب ہو کہ جس سے نہ صرف رات کا وقت آرام کے لئے اور دن کا وقت کام کے

لئے نہ بیٹھے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ خاص و عام عبادت کی طاقت حاصل کرنے کے فوراً بعد دن کا کاروبار شروع کیا جائے تاکہ اِس رُوحانی طاقت سے کام کاج میں مدد اور بہتری ہو۔

توحید:-

سوال ۳۸ : سورۂ اخلاص میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ پاک اِس مادّی دُنیا میں نہیں آیا ہے، کیا آپ اِس سلسلے میں کچھ وضاحت فرمائیں گے؟

جواب : سورۂ اخلاص میں اللہ تعالیٰ کی ہُوِیّت کے بارے میں جو کچھ ارشاد ہُوا ہے وہ ایسے الفاظ میں نہیں ہے، جن کو آپ نے استعمال کیا ہے، خیر ہے، بہرحال آپ کا مقصد خدائے بُزرگ و برتر کی وحدانیت کے بارے میں سوال کرنا ہے، یعنی آپ علمِ توحید کے باب میں بُنیادی باتیں جاننا چاہتے ہیں، سو اس سوال کا مکمل جواب میری ایک تصنیف "پنج مقالہ ۲" کے آخری ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے، آپ اس کا بغور مطالعہ کریں۔

امامِ عالیمقام حضرت مولانا سُلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے ارشاداتِ گرامی میں انسان کی خود شناسی اور خُدا شناسی کی بہت سی روشن حقیقتیں موجود ہیں، اور اِس سلسلے کی آخری اور سب سے اعلیٰ تعلیم نظریۂ "یک حقیقت" سے متعلق ہے، جس کے سمجھنے سے نہ صرف توحید کے تمام سوالات ختم ہو جاتے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ دُوسرے سب اُونچے درجے کے حقائق بھی واضح اور روشن ہو کر کُلّی طور پر اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

اگر یک حقیقت کا نظریہ درست ہے تو اس کا تجربہ سب سے پہلے اپنی ذات پر نہیں بلکہ انسانِ کامل پر کرنا ہوگا، کیونکہ وہی تو ہے جو کُل حقیقتوں کے ازلی و ابدی طور پر ایک ہونے کا نمونہ ہیں، یعنی خود ہادیٔ برحق ہی تمام رُوحوں کی دائمی وحدت اور "یک حقیقت" کی مثال ہیں اور وہی اس کی جانب سے نمائندگی اور اس کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

قرآن اور اسلام میں حضورِ اکرمؐ کے جدِّ اعلیٰ حضرتِ ابراہیمؑ کی خُداشناسی اور توحید کو سمجھنے، سمجھانے اور عملاً پیروی کرنے کے لئے بہترین مثال قرار دی گئی ہے (۶: ۷۶-۷۹) آپؑ نے علی الترتیب ستارے کو پھر چاند کو اور سُورج کو ربّ مانا، اور نتیجے کے طور پر آپؑ خالقِ کائنات کی معرفت کو پہنچ گئے، اس میں حُدودِ دین کے وسیلے سے خُدا کی وحدت یعنی یک حقیقت تک پہنچ جانے کا اشارہ ہے۔

اگر آپ مذاہبِ عالم اور خود اسلام کی تاریخ کو دیکھیں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اپنے مرتبہ پر ہمیشہ ایک جیسی ہے، لیکن اس کی جو کچھ ترجمانی اور وضاحت کی گئی ہے اس میں ترقّی ہوتی آئی ہے اور رفتہ رفتہ نکھار پیدا ہُوا ہے، یہ واقعہ بالکل حضرتِ ابراہیمؑ کی مثال کی طرح ہے، کیونکہ دین بھی بحیثیتِ مجموعی ایک عام آدمی کی طرح نہیں بلکہ حضرتِ ابراہیمؑ کی طرح ہے، لٰہذا مذہب کی عمر گُزرنے کے ساتھ ساتھ حقیقت اور معرفت کی ترقّی ہونی چاہیئے۔

تصویر :-

سوال ۳۹ : امام حاضر اور موجود ہے تو پھر تصویر جماعت خانہ میں کیوں رکھی جاتی ہے؟ کیا یہ بُت پرستی نہیں ہے؟

جواب : اس سوال کا پہلا حصہ غیر منطقی ہے اور دُوسرا حصہ درست ہے، بہر حال اس کا جواب یہ ہے کہ امام کی تصویرِ مبارک ہرگز بُت پرستی نہیں، کیونکہ امامِ زمانؑ خُدا کا زندہ اسمِ اعظم ہے جو "الحیّ القیوم" ہے، اور تصویر اس میں اسمِ اعظم کی اشارت اور علامت ہے، جیسے "اللہ" خُدا کا نام ہے اور لفظ "اللہ" کے حروف یعنی الف، لام، لام اور ہا (ا ل ل ہ) کچھ خُدا تو نہیں ہیں مگر اشارت اور علامت ہیں، جن کی وجہ سے خُدا کے نام کا تعیّن اور شناخت ہو جاتی ہے، لہٰذا نہ حروف فضول ہیں اور نہ لفظِ اللہ، اسی طرح امامِ برحق کی مبارک شخصیّت جس معنیٰ میں خُدا کا سب سے بڑا نام ہے اسی معنیٰ میں اس کی تصویر سب سے بڑا نقش (تحریری شکل) ہے۔

فریضۂ حج اسلام کے سات ستون میں سے ہے، اور اگر اس کے آداب میں ظاہری نظر سے دیکھا جائے تو بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بُت پرستی جیسی لگتی ہیں، مگر حقیقت میں وہ ایسی نہیں ہیں، کیونکہ خُدا و رسولؐ نے اُن میں بہت سی تاویلی حکمتیں رکھی ہیں۔

قرآنِ حکیم (۲/۱۵۸، ۵/۲، ۲۲/۳۲، ۲۲/۳۶) میں شعائر اللہ کا ذکر آیا ہے، جس میں ان شعائر کی حرمت و تعظیم دل کی پرہیزگاری قرار دی گئی ہے، اور صاف طور پر ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کی شخصیت خود شعائر اللہ میں سے ہے، اور اگر یہ

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

بات نہ ہوتی تو آنحضرتؐ نہ فرماتے کہ جس نے مجھ کو دیکھا اُس نے خُدا کو دیکھا، آپؐ ارشاد نہ فرماتے کہ علیؑ کے چہرے کی طرف دیکھنا ایک عبادت ہے، حضورؐ نہ فرماتے کہ قرآن کی طرف دیکھنا عبادت ہے اور امام کی طرف دیکھنا عبادت ہے، پس ان ارشادات سے معلوم ہُوا کہ پیغمبر اور امام کی مقدّس شخصیت شعائر اللہ میں سے ہے لہٰذا امامِ زمان کی تصویر قابلِ احترام ہے۔

مقصدِ تخلیق۔

سوال ۴۰ : اللہ تعالیٰ نے انسان کو کس لئے پیدا کیا؟ انسان اِس دُنیا میں کس مقصد کو پُورا کرتا ہے؟

جواب : یہ سوال نمبر ۲ پر بھی آیا ہے، جس کا مختصر جواب وہیں حصۂ اوّل میں دیا گیا ہے، اور یہاں بھی اُسی جواب کی کُچھ مزید وضاحت کی جاتی ہے کہ رُوح اور رُوحانیت کی پہچان جو ربّ العزّت کی معرفت کا ذریعہ ہے ایک بیمثال اور لازوال مخفی خزانے کی طرح ہے، اس تک رسائی اور شناخت انسان کے لئے انتہائی ضروری ہے، لہٰذا وہ اسی عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے دُنیا میں آیا ہے، چُنانچہ اگر اُس نے اپنی ذات کی معرفت میں خُدا کی معرفت حاصل کر لی، تو وہ بے پایان اور غیر فانی مخفی خزانہ اس کو دیا جاتا ہے ورنہ نہیں، پس انسان کے اِس دُنیا میں آنے کا مقصدِ اعلیٰ یہی ہے۔

جس حدیثِ قدسی کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اگر اس میں عقل و دانش سے خوب سوچا جائے، تو نتیجے کے طور پر یہ رازِ پنہان پردۂ اخفا سے آشکار ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے جتنے وعدے کئے ہیں ان میں

سب سے عظیم ترین وعدہ وہی ہے جس کا تعلق معرفت سے ہے، کہ جو شخص خُداوند تعالیٰ کو کما حقہٗ پہچانے، اس کو پروردگار ایک بیمثال رُوحانی خزانے کی حیثیت سے ملے گا، اسی سے معرفت کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اسی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تخلیق کا مقصدِ اعلیٰ معرفتِ خُداوندی ہے۔

قیامت اور آخرت :-

سوال ۴۱ : روزِ قیامت کیا ہے؟ اور اگر موت کے بعد دُوسری زندگی ہے تو وہ کس نوعیت کی زندگی ہوگی؟

جواب : اس سلسلے میں سوال نمبر ۹، نمبر ۱۹ اور نمبر ۲۱ کے جوابات میں کافی وضاحت کی گئی ہے، اور یہاں بھی کچھ صراحت کی جاتی ہے کہ انسان اس دُنیا میں دو قسم کی زندگی گزارتا ہے، ایک اس کی ذہنی زندگی ہے اور دُوسری خارجی، ذہنی زندگی کی تین شاخیں ہیں یا اس کے لئے تین دُنیائیں ہیں، فکر و خیال کی دُنیا، خواب کی دُنیا، اور رُوحانیت کی دُنیا، اور دُوسری طرف ان تینوں کے مقابلے میں خارجی زندگی ہے جو ظاہر ہے۔

تفکر و تخیّل کی دُنیا میں ایک اِنسان کس طرح زندگی کا تجربہ کر سکتا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ آپ کچھ دیر کے لئے ظاہری حواس کے استعمال کو چھوڑ کر اپنے باطن کی طرف متوجّہ ہو جائیں، اور کچھ اچھے خیالات میں ڈوب جائیں، یعنی ظاہری طور پر دیکھنے، سُننے، سونگھنے، بولنے (چکھنے) اور چھونے کی قوتوں کو کام میں نہ لائیں، بلکہ اپنے دل و دماغ کی طاقتوں کو حرکت میں لا کر خود کو دنیائے فکر و خیال ہی میں محدود کریں، پھر خوب غور و فکر کر کے آپ خود بتائیں کہ آیا اِس حالت میں بھی ایک زندگی نہیں ہے،

جو ظاہری زندگی سے مختلف اور الگ ہے؟ اور اگر آپ اِس کیفیّت کو ایک قسم کی ذہنی زندگی تسلیم کرتے ہیں تو یہ اِس حقیقت کی دلیل ہُوئی کہ آدمی اس جسم کو چھوڑ جانے کے بعد بھی کسی طرح سے زندہ رہ سکتا ہے۔

اسی طرح خواب کی مثال لی جائے، کہ وہ زندگی بھی ظاہری زندگی سے نرالی اور جُدا ہے، اور جسمانی موت کے بعد رُوحانی طور پر زندہ رہنے کا ایک بیّن ثبوت ہے، چُنانچہ ایک باشعور انسان کو اچھی طرح غور کرنا چاہیئے کہ آدمی جب عالمِ خواب میں چلا جاتا ہے تو وہ اس وقت اپنے آپ کو ظاہری وجود میں پاتا ہے یا باطنی وجود میں؟ وہ کس آنکھ سے دیکھتا ہے؟ جسمانی آنکھ سے یا رُوحانی آنکھ سے؟ ظاہری آنکھ تو سوئی پڑی ہے، وہ کس کان سے سُنتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں جسمانی کان کام نہیں کرتے ہیں، وہ خواب میں بولتا ہے کس ذریعے سے؟ یہ زبان تو بالکل خاموش ہی ہے، وہ خواب میں جہاں چلتا ہے تو جسم کے پیروں سے نہیں چلتا، وہ تو رُوحانی طور پر چلتا ہے، پھر اِس سے صاف طور پر معلوم ہُوا کہ سب انسانوں کے لئے رُوحانیت میں بھی ایک دُنیا ہے، جو آخرت کے نام سے ہے، جس میں وہ نہ صرف جسم کو چھوڑ جانے کے بعد زندہ رہ سکتے ہیں بلکہ اِس زندگی میں بھی جزوی طور پر اس کا مشاہدہ اور تجربہ کر سکتے ہیں۔

اَب رہا قیامت کا سوال، تو وہ رُوحانی ترقی کے لئے اِنقلاب اور دینِ حق کی رُوحانی جنگ کی حیثیت سے ہے، جس کی تفصیلات کا حوالہ اِس جواب کے شروع ہی میں دیا گیا ہے۔

تبدّلِ اجسام :-

سوال ۴۲: کیا موت کے بعد کوئی زندگی ہے؟ آیا رُوح کے لئے یہ ممکن ہے کہ یکے بعد دیگرے بہت سے جسموں میں زندگی گزارے؟

جواب: موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں سوال ۴۱ کے تحت کافی بحث ہُوئی ہے، اِس لئے یہاں صرف اس سوال کے دُوسرے حصّے کا جواب دیا جاتا ہے، جو تبدّلِ اجسام کے بارے میں ہے، اور اِس سلسلے میں سب سے پہلے اثبات میں جواب دیتا ہُوں، پھر چند روشن دلیلیں بطورِ ثبوت کے پیش کی جاتی ہیں :-

دلیلِ اوّل: جاننا چاہئے کہ خُدا کی رُوح اور خُدا کا نور ایک ہی چیز ہے، چُنانچہ جب آنحضرتؐ پر قرآن نازل ہو رہا تھا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرا نُور کبھی بُجھنے والا نہیں، اِس کے معنی یہ ہُوئے کہ جو خدائی رُوح آدمؑ میں پھُونکی گئی تھی، وہ انبیاء اور ائمہؑ کے سلسلے میں جسم بہ جسم چلتی آئی ہے، اِس سے ثابت ہے کہ لوگوں کی رُوحیں بھی ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی رہتی ہیں، کیونکہ خُدائی رُوح نے اپنی عملی ہدایت میں یہی نمونہ پیش کیا ہے۔

دلیلِ دوم: قرآن کے مطابق ہم بنی آدم یعنی آدم کی اولاد ہیں اور جب نوحؑ کی کشتی طوفان میں تیرتی تھی تو اس وقت ہم نوح کے ساتھیوں کی پشتوں میں روح کے چھوٹے چھوٹے ذرات کی حیثیت سے تھے (۱۷/۳) اور پُشت بہ پُشت یہاں آکر ظاہر ہوئے، سو یہ حقیقت ہے کہ رُوح

جسم کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔

دلیلِ سوم: قرآن کے ارشاد (۲۹/۶۴) کے مطابق آخرت کا گھر زندہ ہے اور زندہ سب سے پہلے انسان ہے اور اس کے بعد حیوان ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان دُنیا میں ظاہر ہونے سے پہلے بھی جسم میں تھا اور موجودہ جسم کو چھوڑ جانے کے بعد بھی کسی جسم میں منتقل ہو جاتا ہے، خواہ وہ جسمِ لطیف ہو یا کثیف، انسانی ہو یا حیوانی، پھر یہ بات صحیح ہے کہ رُوح ہمیشہ لباس کی طرح جسموں کو استعمال کرتی ہے۔

دلیلِ چہارم: ہمارا یہ جسم چالیس دن کے اندر اندر ذرّہ ذرّہ فرسودہ ہو کر پُوری طرح سے ختم ہو جاتا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ نئے ذرّات کے ذریعے سے اتنے عرصے میں مکمل طور پر بنتا بھی ہے، اس حساب سے ہمارا بدن سال میں نو مرتبہ بدل جاتا ہے، جس کا اندازہ بالوں اور ناخنوں کے بڑھنے سے لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح جسم ایک سرے سے بنتا رہتا ہے اور دوسرے سرے سے گھستا جاتا ہے، اس سے یہ معلوم ہُوا کہ انسان کا جسم ہمیشہ بدلتا رہتا ہے یعنی آدمی یکے بعد دیگرے اجسام کو بدلتا رہتا ہے۔

دلیلِ پنجم: قرآنِ مقدّس کے کئی مقامات پر خاص کر سورۂ یاسین (۳۶/۳۶) میں ہے کہ خُداوند تعالیٰ نے ہر چیز کو جوڑے میں اس طرح پیدا کیا ہے کہ جوڑے کے بغیر اس کا کوئی قیام نہیں، جیسے جسم اور رُوح، اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ جسم کے بغیر رُوح ٹھہر نہیں سکتی ہے، اور رُوح کے بغیر جسم فنا ہو جاتا ہے، جیسے وہ بدن جس سے رُوح نکل چکی ہے، اور اس کائنات کے قائم رہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ایک عظیم رُوح ہے، جس کو عالمگیر رُوح یا نفسِ کُلّی کہا جاتا ہے، اس سے معلوم ہُوا کہ رُوح بغیر جسم کے

نہیں رہتی ہے بلکہ ایک جسم سے دُوسرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔

دلیلِ ششم: ہماری رُوح کے لئے تین قسم کے جسم ہیں، ایک خاکی ہے جو موجودہ جسم ہے، دُوسرا نُورانی ہے اور تیسرا ابداعی ہے، ان باتوں کا تعلق رُوحانیت کے تجربے سے بھی ہے اور قرآنی حکمت سے بھی (۱۶/۸۱) چُنانچہ رُوح ہمیشہ ان جسموں سے وابستگی رکھتی ہے۔

کتابِ ناطق اور کتابِ صامت:۔

سوال ۴۳: جب پیغمبروں نے زمانۂ آدم سے لے کر آنحضرتؐ کے عہدِ مبارک تک لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سُنایا، اور اس کے بعد لوگوں کی ہدایت کے لئے امامت کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا، تو پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ساتھ خاموش (صامت) کتابیں کیوں بھیجیں، مثلاً توریت، زبور، انجیل، اور قرآن؟

جواب: جاننا چاہئے کہ آسمانی کتاب، پیغمبر اور امام مل کر ایک ہی خدائی ادارہ ہیں، یہ کچھ الگ الگ متضاد چیزیں تو نہیں کہ تضاد پیدا ہونے کی وجہ سے سوال اُٹھے کہ "یا یہ ہونا چاہئے یا وہ" جبکہ کتاب پیغام ہے، رسُول پیغام بر ہے اور امام اس کا جانشین۔

اللہ تعالیٰ کا وہ پیغام جو کسی پیغمبر پر نازل ہُوا ہے اور جو لوگوں کو پہنچایا گیا ہے وہ کتابِ صامت کی حیثیت سے آئندہ زمانے کے لئے بھی موجود ہونا چاہئے، تاکہ اس سے لوگوں کو نہ صرف یہ ثبوت ملے کہ جس شخص نے یہ پیغام لایا وہ برحق رسول تھا، بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ پیغام ذریعۂ عبرت اور وسیلۂ

ہدایت بھی ہو، کیونکہ جہاں امام نُور اور ولیِّ امر ہے وہاں اس کو اختیار حاصل ہے کہ آسمانی کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے ہدایت کرے یا ذاتی طور پر نُورانی ہدایت کرے۔

قرآن (۴/۵۴) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب اور حکمت عطا کی ہے اور ان کو عظیم (رُوحانی) سلطنت عنایت کردی ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ پیغمبر ہو یا امام جو آلِ ابراہیمؑ ہیں ان کے ساتھ ہمیشہ آسمانی کتاب، حکمت اور عظیم رُوحانی مملکت موجود رہتی ہے۔

اگر قرآنِ صامت نہ ہو تو قرآنِ ناطق کی تعریف و توصیف خُدا کے کس کلام سے ہو سکتی ہے، قرآن ہے اس لئے قرآن کا نور ہے، قرآن ہے لہٰذا معلّمِ قرآن ہے، قرآن موجود ہے اس لئے آج اُن لوگوں کا درجہ بلند ہے جو قرآن کے باطن کو یعنی تاویلی حکمت کو جانتے ہیں۔

اسمِ اعظم اور نبوّت:-

سوال ۴۴ : اگر ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ حضرتِ ابو طالب نے آنحضورؐ کو اسمِ اعظم دیا تھا، جس کے ذریعے آپؐ نے خصوصی ذکر کیا (اور نتیجے کے طور پر محمّد مُصطفیٰؐ کو نبوّت ملی) پھر کیا اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ آنحضرتؐ نے ذکر و عبادت کے وسیلے سے نبوّت کو خود ہی حاصل کر لیا تھا؟ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ایسی خاص عبادت کے بغیر خُدا آنحضرتؐ کو پیغمبر بناتا؟

جواب : (الف)، اگرچہ دینِ اسلام کا مکمّل ظہور آنحضرتؐ ہی کے زمانے میں ہُوا، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس سے پہلے دینِ حق

نہیں تھا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السّلام نے خدائے واحد کے ایک ہی راستے کی دعوت کی تھی اور وہ دینِ فطرت یعنی اسلام ہی تھا، آپ قرآنِ حکیم میں حضرتِ نوحؑ (۱۳/۴۲) اور حضرتِ ابراہیمؑ (۷۸/۲۲) کے دین اور شریعت کے بارے میں ذرا غور کریں، تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ آنحضرتؐ کے آباو اجداد کے سلسلے میں نورِ امامت کا عظیم الشان مرتبہ جاری تھا، چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے کہ:۔

فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا (۴/۵۴)۔

ہم نے تو ابراہیمؑ کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی ہے اور ان کو بہت بڑی سلطنت بھی دی ہے۔ جاننا چاہئے کہ آلِ ابراہیمؑ کی دو شاخیں ہیں، ایک حضرتِ اسماعیلؑ سے ہے اور دوسری حضرتِ اسحاقؑ سے اور اس آیۂ کریمہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا تعلق دونوں خاندانوں سے ہے۔

(ب) مذکورہ بیان سے یہ حقیقت ظاہر اور روشن ہو جاتی ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرتِ اسماعیلؑ کی دُعا کے مطابق اللہ پاک نے آلِ ابراہیم کی دونوں شاخوں کے مخصوص افراد کو برگزیدہ فرمایا تھا (۲/۱۲۷-۱۲۸) چنانچہ اسماعیلیوں کا یہی عقیدہ ہے کہ حضرت ابوطالب علیہ السّلام اپنے زمانے میں امامِ مقیم کی حیثیت سے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ ہر طرح سے آنحضرتؐ کی حمایت کرتے تھے، (ملاحظہ ہو کتاب "الامامۃ فی الاسلام" ص۱۵۵)۔

(ج) اب سوال ہے کہ آیا حضورِ اکرمؐ نبوّت سے پہلے ذکر و عبادت کرتے تھے یا نہیں؟ اگر کرتے تھے تو کس مذہب کے مطابق؟ کیا اُن پر بچپن ہی میں یا نوجوانی میں وحی شروع ہوئی تھی یا آپؐ کا ظاہری طور پر بھی کوئی

سکھانے والا تھا؟ اور اگر کہا جائے کہ آغازِ نبوّت سے قبل حضورؐ پر نہ تو کوئی وحی نازل ہوتی تھی اور نہ ہی آپؐ کو ظاہر میں کوئی دین سکھانے والا تھا، بلکہ آنحضرتؐ نے خود بخود اللہ تعالیٰ کی عبادت شروع کی، تو پھر آپؐ کے اُسوۂ حسنہ اور سُنّتِ مطہرہ کی پیروی کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ ہر شخص کو بغیر کسی رہنما کی ہدایت کے خود بخود چلنا چاہیئے، اور نتیجے کے طور پر یہ ایک ایسا نظریّہ ہوگا کہ جس سے تمام انبیاء کے دُنیا میں آنے کا مقصد فضول اور عبث ثابت ہوگا۔

(د) اگر عقل و دانش سے کام لے کر سوچا جائے تو آپ کے پُورے سوال کے لئے اِس سے بہتر کوئی جواب نہیں جو خود آنحضرتؐ کی تمام زندگی اور نمونۂ عمل کے بارے میں ارشاد ہُوا ہے کہ:۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا (۳۳/۲۱)۔

تمہارے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ اور روزِ آخرت کی اُمید رکھتا ہو اور کثرت سے ذکرِ الٰہی کرتا ہو رسُول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔

اِس آیۂ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ حضورِ اکرمؐ نے نہ صرف نبوّت کے دوران اپنی حیاتِ طیبہ کو اُمّت کی پیروی کے لئے بہترین نمونہ بنایا بلکہ اِس سے پہلے بھی آپؐ کی مبارک زندگی انسانیت و دینداری کے تمام فضائل و کمالات سے بھرپُور تھی، کیوں نہ ہو جبکہ آپؐ تمام پیغمبروں کے سردار، خُلقِ عظیم (۶۸/۴) کے مالک اور سب سے بہترین نمونۂ عمل تھے۔

(ہ) کیا پیغمبرِ خداؐ کی پاک زندگی کچھ اس طرح سے لوگوں کے لئے

اُسوۂ حسنہ، عُمدہ نمونہ اور بہترین مثال ہو سکتی تھی کہ حضورِ اقدسؐ چالیسؑ سال کی عمر تک انسانی اور اخلاقی خُوبیوں کے علاوہ دینی صلاحیتوں کو بحدِ امکان اُجاگر نہ کرتے، نبوّت سے قبل مذہب اور رُوحانیّت کے جو جو مراحل ہوتے ہیں اُن سے عملاً نہ گزرتے اور پھر یکایک شرفِ نبوّت سے مشرّف ہو جاتے؟ یا یہی نظریّہ دُرست ہے کہ آنحضرت شروع ہی سے ملّتِ ابراہیمی کے پابند تھے، آپؐ اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت کی اُمید رکھتے تھے اور کثرت سے ذکر کر لیا کرتے تھے؟ اگر ہم کہیں کہ اسمِ اعظم اور ذکر و عبادت کے نتیجے میں آنحضرتؐ کو یہ عظیم ترین مرتبہ ملا تھا، تو اس سے رحمتِ خُداوندی کی ہرگز نفی نہیں ہوتی، جبکہ حضور کی رُوحانی ترقی کے تمام وسائل اللہ تعالیٰ کی رحمت کے تحت آتے ہیں اور ہمارا یُوں کہنا ایک ذیلی اور ضمنی حقیقت ہے، اس نظریئے کے بغیر ہم کس طرح پیغمبرِ برحقؐ کی حیاتِ طیّبہ سے مثال لے کر یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ ذکر و بندگی سے رُوحانی ترقی ہوتی ہے۔

دو کیوں؟:-

سوال ۴۵ : ان دونوں نظریوں کے درمیان یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ نظریّۂ "یک حقیقت" کو مانا جائے یا کہ نظریّۂ "نورِ واحد" کو جبکہ آپ خود فرما رہے ہیں کہ نور ایک ہی ہے؟ اور اسی منطق کے مطابق یہ سوال بھی ہے کہ دو مقدّس کتابوں کی ضرورت کیوں، یعنی کتابِ صامت اور کتابِ ناطق، جبکہ دو نہیں صرف ایک ہی کافی ہونے کا تصوّر تسلیم کیا گیا ہے؟

جواب : ہاں، نورِ مطلق ایک ہی ہے، وہی نورِ واحد اور یک حقیقت

ہے، کیونکہ جو نور کامل اور کُل ہے وہ ایک ہی ہے اور تمام حقیقتوں کی حقیقت (یک حقیقت)، اِس سے الگ نہیں ہے، پھر وہ سوال ختم ہوگیا "جو یک حقیقت" اور "نُورِ واحد" کو جُدا جُدا فرض کرنے سے پیدا ہُوا تھا، کیونکہ توحید کا نظریّہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، دو ہرگز نہیں ہو سکتے۔

یک حقیقت (MONOREALISM) اور نُورِ واحد کا مطلب ایک ہی ہے، اور وہ نظریّہ بھی دراصل ایک ہی ہے، دو الگ الگ نظریئے نہیں ہیں، کیونکہ حقیقت کے معنی ہیں عقل و دانش اور علم و حکمت کا نور، اور کوئی دانشمند یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ حقیقت اور نور دو متضاد چیزیں ہیں۔

دُوسرا سوال دو کتابوں کے بارے میں ہے، یعنی پُوچھا گیا ہے کہ جہاں بولنے والی کتاب کا وُجُود ممکن ہے، وہاں خاموش کتاب کی ضرورت کیا ہے؟ اور کہا گیا ہے کہ پہلے سوال اور دُوسرے سوال کا ایک ہی منطق ہے حالانکہ یہ بات دُرست نہیں ہے، کیونکہ پہلے سوال میں ایک چیز کے دو مختلف نام ہیں اور دُوسرے میں دو الگ الگ چیزیں ہیں، بہرحال سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ کتابِ ناطق اور کتابِ صامت دونوں کا ہونا صحیح ہے، وہ صرف ظاہر میں دو ہیں مگر باطن میں ایک ہیں، تاکہ ایک ہادیٔ برحق اور نُور ہو اور دوسری کتاب، جیساکہ قرآن میں ہے۔

مجالسِ دینی:-

سوال ۴۶: کیا یہ درست ہے کہ ایک سیدھا سادہ اسماعیلی جو عقیدت مند ہو وہ محض عقیدہ ہی سے دین کا بہت سا فائدہ حاصل کر سکتا

ہے جبکہ وہ دین کی مختلف مجالس میں حصّہ لیتا ہے ؟

جواب : ہاں یہ صحیح ہے کہ اگر ایک سادہ اسماعیلی اپنے مذہب پر مکمل عقیدہ رکھتا ہے اور اس کی باتوں پر عمل کرتا ہے تو وہ نجات کا حقدار ہے، اور اگر وہ اس کے ساتھ ساتھ علم الیقین کو بھی حاصل کرتا ہے تو وہ فرشتہ بھی بن سکتا ہے، یہاں مذہب کی مختلف مجالس میں حصّہ لینے کی مُراد دین کی تمام باتوں پر عمل کرنا ہے۔

اس سوال کے پس منظر میں ایک چیز نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آج کل مادّی علوم کی فراوانی ہے جن کے حصول کے بعد ہمارے بعض نوجوانوں کو مذہب کی کچھ رسومات پر تنقید کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے حالانکہ یہ خیال غلط ہے، کیونکہ صرف ظاہری اور دُنیاوی علم کی کسوٹی سے عقائد کو نہیں پرکھا جاسکتا، عقائد کی حکمتوں کو سمجھنے کے لئے دینی علم کی ضرورت ہے۔

خودی یا اَنا :-

سوال ۴۷ : آپ نے کہا ہے کہ انسانی جسم میں لاتعداد رُوحیں رہتی ہیں، جس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں انسان کی خودی یا اَنا جسے وہ "میں" کہتا ہے وہ کیا چیز ہے؟ آیا وہ ایک الگ رُوح ہے یا تمام رُوحوں کا مجموعہ ہے ؟

جواب : یہ ایک مُفید سوال ہے کیونکہ اس میں خودی اور خودشناسی کی اہم باتیں آسکتی ہیں، چُنانچہ جاننا چاہیئے کہ خودی اور اَنا جسے انسان "مَیں" کہتا ہے، وہ وجودِ انسانی میں ایک بیمثال حقیقت ہے، اِس لئے کہ وہ نہ

تو ایک الگ رُوح ہے اور نہ ہی تمام رُوحوں کا مجموعہ ہے بلکہ وہ اُن ساری رُوحوں اور قوتوں کی وحدت ہے جو اِنسان کی ہستی میں موجود ہیں، اور یہ وحدت جو انسان کی خودی کی حیثیت سے ہے اللہ تعالیٰ کی وحدت کی مثال ہے یا یُوں کہنا چاہیئے کہ یہ یک حقیقت (MONOREALISM) کی طرح ہے۔

جس طرح ایک کامیاب حکومت میں افراد آتے جاتے رہتے ہیں مگر قانُون اور حکومت قائم اور برقرار رہتی ہے اسی طرح آدمی میں روحیں اور قوتیں آتی جاتی رہتی ہیں، مگر اس کی اَنا یعنی ذرّاتِ ہستی کی توحید وہی رہتی ہے جو کبھی تھی، اور علم وشعور ہمیشہ ذرّاتِ رُوح میں منتقِل ہوتا رہتا ہے۔

اختیار اور مقدّر:۔

سَوال ۴۸: انسان کے مختار ہونے یا مجبُور ہونے کے درمیان جو سوال پیدا ہوتا ہے، وہ قرآن میں کِس طرح حل کیا گیا ہے؟

جَواب: یہ باتیں قرآن ہی کی روشنی میں ہیں جو سمجھنا چاہیئے کہ مخلوق تین قسموں میں ہیں، فرشتہ، انسان اور حیوان، فرشتہ صرف عقل رکھتا ہے، حیوان صرف نفس رکھتا ہے اور انسان عقل ونفس دونوں رکھتا ہے۔

جب فرشتہ کو صرف عقل دی گئی ہے تو اس کے معنی یہ ہُوتے کہ وہ نیکی پر مجبُور ہے اور جہاں حیوان کو صرف نفس دیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ بدی پر مجبور ہے، اور جس طرح انسان کو عقل ونفس دونوں ملے ہیں، تو اس

کا مطلب یہ ہُوا کہ وہ فرشتہ اور حیوان کے درمیان ہے، اس لئے وہ عقل کے تقاضا کے مطابق نیکی بھی کرسکتا ہے اور نفس کی خواہش کے مطابق بدی بھی کرسکتا ہے، پس ان دونوں چیزوں کے درمیان کسی ایک کو پسند کرنے کو اختیار کہتے ہیں، اس سے معلوم ہُوا کہ انسان مختار ہے۔

انسان مختار ہے مگر ایک محدود دائرے میں، اس کا اختیار صرف ان صلاحیتوں کے استعمال میں ہے جو اسے عطا کر دی گئی ہیں اور یہ بھی ہے کہ اس کا دائرۂ اختیار وسیع سے وسیع تر ہوسکتا ہے یہاں تک کہ اس کا اختیار خُدا کے اختیار سے مل کر ایک ہوجائے، جس کے معنی توکّل کے ہیں۔

قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ: اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا (۲/۲۸۶) پھر فرمایا گیا ہے کہ: اور ہم نے اس کو (نیکی اور بدی کے) دونوں راستے دکھا دیئے (۹۰/۱۰) نیز ارشاد ہے کہ: بلکہ انسان (ہر سطح پر) اپنے آپ کو دیکھتا ہے (۷۵/۱۴) ان ارشادات سے معلوم ہُوا کہ انسان مجبور نہیں بلکہ مختار ہے، کیونکہ "وسعت" کا اشارہ عقلی اور نفسی قوّتوں کے دائرۂ اختیار کی طرف ہے اور تکلیف کے معنی خُداوندی اوامر و نواہی ہیں، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ہر انسان کا دائرۂ اختیار اس کی عقلی و علمی حیثیت کے مطابق ہُوا کرتا ہے اور ذِمّہ داری بھی اسی کے مطابق عائد ہوجاتی ہے، اور اگر آدمی کے سامنے خیر و شر کے دونوں راستے ہیں تو اس کے معنی بھی اختیار کے ہیں نہ کہ مجبُوری کے، اگر مجبوری مقصود ہوتی تو صرف ایک ہی راستہ مقرر ہوتا، جس طرح فرشتوں اور حیوانوں کے لئے ایک ایک راستہ دکھایا گیا ہے، اور اگر انسان میں اپنے آپ کو دیکھنے کی صلاحیت موجُود ہے اور عملاً وہ خود کو بھی دیکھ سکتا ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ نیکی اور بدی دونوں کے آغاز و

انجام کو خُوب جانتا ہے اور دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اُس پر عمل کر سکتا ہے جس کے معنی اختیار کے ہیں۔

دُوسری طرف سے مقدّر یعنی تقدیر یا قسمت کی بات آتی ہے، حالانکہ یہ اصطلاحیں قرآنی نہیں ہیں، بہرحال یہ عقیدہ کہ "تقدیر اور قسمت میں جو کچھ ہے وہی ہوگا" دُرست نہیں ہے، جبکہ روشن دلیلوں سے واضح کیا گیا کہ انسان مجبُور نہیں ہے، بلکہ وہ اخلاقی اور دینی اوامر و نواہی کے مخصوص دائرے کے اندر آزاد اور مختار ہے لہٰذا قسمت اور تقدیر کی بات خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

صلوات :-

سوال ۴۹ : صلوات کے صحیح معنی یا تاویل بتائیں، کیونکہ جب بموجبِ ارشادِ قرآن (۲۱/۱۰۷)، محمدؐ رسُول اللہؐ خود تمام جہانوں کے لئے سرچشمۂ رحمت ہیں، تو آنحضرتؐ پر رحمت نازل ہونے کی سفارش کیونکر مناسب ہو سکتی ہے؟

جواب : یہ سوال بہت پہلے کچھ عزیزوں نے پُوچھا تھا، اور ان کو جس طرح جواب لکھا گیا تھا، وہ کتاب "پنج مقالہ ۴" کے صفحہ ۲۷ تا ۲۹ میں درج ہے، نیز کتابِ وجہِ دین حصّہ دوم" کلام ۵۰ اور "دُعا مغزِ عبادت" کے صفحہ ۶۱-۶۹ ملاحظہ ہو، اور کتابِ ہٰذا حصّہ اوّل میں سوال ۱۳۰ کو بھی دیکھیں۔

حاضر امامؑ :-

سوال ۵۰ : حاضر امامؑ کیا ہیں؟ اُن کا اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ کیا ہے؟ اور اس بارے میں قرآن کا ارشاد کیا ہے؟

جواب : حاضر امام اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم ہے، وہ خُدا کا چہرہ ہے، وہ اس کا نور اور منظہر ہے، وہ اس کا خلیفہ اور نمائندہ ہے، اس کا لقب امیر المومنین، اس کا مرتبہ ولیِ امر، اس کی شان حیّ و قیوم، اس کی شاہنشاہیت عالمِ باطن اور رُوحانیت، اس کی مہربانی علم و حکمت، اس کا انعام حقیقی محبّت، اس کا معجزہ رُوحانی روشنی، اس کے برحق ہونے کا ثبوت ہمیشہ اس کا ظاہر و موجود رہنا، اس کا ظاہری نور کامیاب ہدایت، اس کا راستہ صراطِ مستقیم، اس کا مذہب دینِ فطرت، اس کی رہنمائی کی پیروی کا صلہ عالمِ ملکوت کی سلطنت، اور اس کی شناخت کا بدلہ تاجِ معرفت ہے۔

آپ حاضر امام کے بارے میں حصّۂ اوّل میں سوال ۱۵ کے جواب کو بھی پڑھیں اور "امام شناسی" کے تینوں حصّوں کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔

This Page Intentionally Left Blank

(۱۰۰) سؤال

حصّهٔ سوم

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

This Page Intentionally Left Blank

فہرستِ عنواناتِ "سوسوال" حصّہ سوم

سوال نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
-	نگارشِ آغاز	۹۷
۵۱	تسبیح کے دانے	۱۰۱
۵۲	اسمِ اعظم	۱۰۱
۵۳	مذہب اور سائنس	۱۰۲
۵۴	حقیقی مومن	۱۰۴
۵۵	ہندو مذہب	۱۰۴
۵۶	صراطِ مستقیم	۱۰۵
۵۷	ناندی کی حکمت	۱۰۶
۵۸	نادِ علی	۱۰۷
۵۹	تعجّب ہے	۱۰۸
۶۰	اِنسانی حقیقت	۱۰۹
۶۱	نیاز اور فرشتہ	۱۱۰
۶۲	تقیّہ	۱۱۰
۶۳	نُورِ واحد	۱۱۱
۶۴	درجۂ عارف	۱۱۳
۶۵	یہ فرق کیوں؟	۱۱۵

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

سوال نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
۶۶	دُنیا میں تکالیف کیوں؟	۱۱۸
۶۷	شریعت	۱۲۱
۶۸	امامت اور عورت	۱۲۲
۶۹	مقامِ معرفت	۱۲۴
۷۰	اسماعیلی جماعت	۱۲۴
۷۱	متوفیّ کے لئے کپڑے	۱۲۶
۷۲	امام کے معنی	۱۲۷
۷۳	پیر و مُرشد	۱۲۷
۷۴	لفظِ امام کا ہم معنی	۱۲۹
۷۵	غیر اسماعیلی	۱۳۰

ISW
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

نگارشِ آغاز

اے خُداوند برحق! اے قادرِ مطلق! تُو اپنی رحمتِ بے پایان سے اِس بندۂ کمترین کو نعمت شناسی اور شکر گزاری کی توفیق و ہمّت عطا فرما، تاکہ یہ عاجز لفظی، معنوی اور عملی طور پر تیرے مقدّس دین کی ظاہری و باطنی نعمتوں کا کچھ شکر کر سکے، پروردگارا! ارواحِ مومنین پر شب و روز تیری عنایتوں کی جو بارش ہو رہی ہے وہ کتنی عجیب ہے! اور تیری نظرِ کیمیا اثر کس قدر معجزانہ ہے!

میرے مولا! مُجھے عجز و انکساری کی مخفی دولت سے مالامال فرما، اپنی پُرلذّت محبّت کی منزلِ فنا میں ایک پُرسکون اور راحت بخش مقام عطا کر اور اسرارِ معرفت کے خزانے کا دروازہ کھول دے تاکہ مَیں تیری لازوال مہربانیوں کی شکر گزاری میں مصروف ہو کر دُنیا کی اذیتوں کو کُلّی طور پر فراموش کر دوں۔

الحمد للّٰہ کہ اَب کتاب "سو سوال" کا تیسرا حصّہ بھی مکمل ہو گیا، اور کتابت و طباعت کے لئے تیار ہے، اور اِن شاء اللّٰہ تعالیٰ عنقریب حصّۂ چہارم بھی مکمل ہونے کو ہے، میرا یقین ہے کہ سو سوال کی کتاب میری کتابوں میں بہت اہمیّت والی ہو گی، اِس لئے کہ اس میں شمالی امریکا جیسے عظیم مُلک کی عظیم جماعت کے منتخب سوالات کے لئے مدلّل اور تسلّی بخش جوابات موجود ہیں۔

حقیقی علم کا یہ پختہ اور زرین اُصول ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یاد رہے کہ اگر کسی سوال کا جواب دُرست طریق پر دیا جاتا ہے، اور اس میں صحیح منطق اور علم و

دانش کی بھرپُور روشنی ہے، حکمت وتاویل ہے، اور وہ رُوحانی ہدایت کے مطابق ہے تو ایسے جواب سے نہ صرف وہی ایک مطلوبہ سوال حل ہو جاتا ہے بلکہ دانشمند اس کی روشنی میں کئی کئی مسائل کو حل کر سکتا ہے، چُنانچہ میرا یہ دعوے حق بجانب ہے اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ سوسوال کی کتاب میں درحقیقت ہزاروں سوالات کا حل موجود ہے، کیونکہ حقیقی علم کا تصوّر ایک ایسے درخت کی طرح ہے، جس کا تنہ ایک ہے، اس کی موٹی شاخیں تھوڑی سی ہیں، پھر وہ درخت شاخ درشاخ ہو کر پھیل گیا ہے، درخت کی ترتیب وترکیب کا یہی حال علم کا بھی ہے کہ اگر تنہ اور موٹی شاخوں کی طرح پختہ اور بنیادی علم سے جواب مہیا کیا گیا ہے تو سوالات کی لاتعداد شاخیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔

اِس حقیقت کی ایک مثال یہ ہے کہ دانشمند کے نزدیک سوالات اُصولی طور پر آپس میں مل جاتے ہیں، اس کا ثبوت آپ کو اُس وقت ملے گا جبکہ ایک عام آدمی کے کئی سوالات کی ایک فہرست آپ کے سامنے آئے، اگر آپ غور سے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ اُس نے بعض دفعہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے ایک ہی سوال کو کئی طرح سے پیش کیا ہے، حالانکہ بُنیادی طور پر وہ ایک ہی سوال ہے۔

بہرکیف سوسوال کی کتاب میں جو کچھ علم وآگہی کی خُوبیاں ہیں وہ میرے آقا و مولا امامِ زمان صلوات اللہ علیہ وسلامہ کی ہیں جو نورِ ہدایت کا سرچشمہ اور علم وحکمت کا وسیلہ ہیں، اور اگر اس میں کچھ خامیاں ہیں تو وہ میری اپنی وجہ سے ہیں، کیونکہ میں اس کی مہربانی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔

خانۂ حکمت اور عزیزوں کی جمعیّت مجھ کو میرے خُداوند کا ایک گرانقدر عطیہ ہے، پروردگارِ عالم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اِس مقدّس ادارے کی مدد سے علم گُستری جیسی پاک و پاکیزہ خدمت کے لئے کوشاں ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ

ہماری سعادتِ دارین اسی میں ہے۔

ہمارے قابلِ قدر اور ہوشمند اراکین اِس حقیقت سے واقف و آگاہ ہیں کہ سوائے علم کے دُنیا میں کوئی ایسی دولت نہیں جو کسی کمی کے بغیر سب کو پہنچ سکے اور جس کے صرف کرنے میں زیادہ سے زیادہ ثواب ہو، یقیناً صرف علم ہی ایسی دولت ہے جو ہمہ رس بھی ہے اور لازوال بھی۔

حقیقی علم کی روشنی پھیلانے سے نہ صرف مومنین و مُسلمین ہی کو فائدہ ہو سکتا ہے بلکہ اِس سے تمام بنی نوعِ انسان کی ذہنی اُلجھنیں بھی دُور ہو سکتی ہیں، جس کے سلئے دُنیا کی بڑی بڑی قومیں ریسرچ (تحقیق) کر رہی ہیں اور آگے چل کر اعلیٰ سطح پر یہ ریسرچ ہونے والی ہے۔

اَب سائنسی ترقی کے نتیجے پر سیّارۂ زمین کی مُسافتیں سمٹ سمٹ کر نہ ہونے کے برابر ہو چکی ہیں، دُور و دراز کے ممالک ایک دُوسرے سے بہت قریب ہو گئے ہیں، اور دُنیا والے سب نئی روشنی میں ایک دوسرے کو پہچاننا چاہتے ہیں، تو کیا ایسے میں ہمیں خاموش بیٹھنا چاہئے۔

دُنیا کی ہر قوم کے پاس کچھ نہ کچھ مفید و مخصوص مادّی چیزیں ہُوا کرتی ہیں، مثلاً سونا، چاندی وغیرہ، اور ایسی چیزوں کو قومی سرمایہ قرار دے کر دُنیاوی طور پر فائدہ اُٹھایا جاتا ہے، مگر ہماری جماعت کے پاس جو خاص اور عظیم شے ہے وہ مادّی نہیں رُوحانی ہے، وہ حقیقی علم ہے جس کو نُورانی ہدایت بھی کہتے ہیں، یہ علم اور ہدایت ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے، سو لازمی ہے کہ ہم اس کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دیں اور اِس سے فائدہ اُٹھائیں اور فائدہ پہنچائیں۔

دُعا ہے کہ قادرِ مراد رسان علمی خدمت میں شرکت کرنے والوں کو دین و دُنیا کے نیک مقاصد میں کامیاب بنائے! یہ دُعا صرف زبان سے کے بنائے ہوئے

الفاظ ہی میں محدود نہیں بلکہ دل وجان کے لطیف ارمانوں میں بھی ہے، دُعا ہے کہ کتاب کا ہر موضوع، ہر پیرا، ہر جملہ، ہر لفظ اور ہر حرف زبانِ حال سے یہ دُعا کرے کہ الٰہی! تُو اپنی رحمتِ بیکران سے ان عزیزوں کو دونوں عالم کی کامیابی اور سرفرازی عطا فرما، جنہوں نے اس سدابہار گلشن کی آبادکاری میں حصّہ لیا ہے! آمین یاربّ العٰلمین !!

فقط بندۂ عاجز
مُصنّف
۵ راگست ۱۹۷۸ء

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تسبیح کے دانے:-

سوال ۵۱ : ہم ننانوے تسبیح کے دانے کیوں رکھتے ہیں؟ اور اِس تسبیح میں ۳۳، ۳۳، ۳۳ کے تین حِصّے کیوں ہیں؟

جواب : تسبیح کے دانے دراصل سَو ہُوا کرتے ہیں، اور رشتۂ تسبیح میں ۳۳، ۳۳، ۳۳ کے تین حِصّے اس لئے بنائے گئے ہیں کہ عالمِ اسلام میں تسبیح فاطمہ کی بہت بڑی اہمیّت ہے، اور وہ ہے: ۳۴ بار اللّٰہ اکبر، ۳۳ بار الحمدلِلّٰہ، ۳۳ بار سُبحان اللّٰہ، اور ایک بار لا الٰہ اِلاّ اللّٰہ، چُنانچہ اِس مبارک تسبیح کے مطابق دانے مرتب کئے گئے ہیں، جو ۳۳+ ۳۳+ ۳۳+ ۱= ۱۰۰ دانے ہوتے ہیں، ملاحظہ ہو اسماعیلی فقہ کی مشہور کتاب "دعائم الاسلام (عربی) جُزءِ اوّل" صفحہ ۲۰۳۔

اسمِ اعظم:-

سوال ۵۲ : کیا اسمِ اعظم کے بغیر کسی کو نجات حاصل ہو سکتی ہے؟ کیا اسمِ اعظم کا لینا ضروری ہے؟

جواب : (الف) جہاں اسمِ اعظم کے معنی خود امامِ زمان ہیں وہاں خُدا تعالیٰ کے اِس زندہ اور بُزرگ ترین نام کے بغیر نجات ناممکن ہے، اور جہاں

اسمِ اعظم سے کوئی قولی نام مُراد ہے وہاں اس کے بغیر بھی نجات حاصل ہو سکتی ہے، کیونکہ ایسے لفظی بزرگ نام پر عمل کرنا اور اس میں کامیابی حاصل کرنا صرف ایک فضیلت ہے یعنی ایک زائد مرتبہ ہے۔

(ب، اگر لفظی اسمِ اعظم کے بغیر کوئی نجات نہ ہوتی تو امام ایسے بُزرگ نام کو اپنے تمام مُریدوں کے لئے ضروری اور لازمی قرار دیتے، سب جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ خصوصی عبادت مزید رُوحانی ترقی کے لئے ہے۔

(ج، کارِ بزرگ اُن اسماعیلیوں کو ضروری ہے جو امامِ زمان کے رُوحانی مُعجزات دیکھنے کے خواہشمند ہیں یا یہ کام اُن معلّمین کو چاہیئے جو رُوحانی علم حاصل کرنے کے قابل ہو چکے ہیں۔

مذہب اور سائنس:-

سوال ۵۳ : سائنس اور مذہب کے بارے میں:

(الف، اگر ایک شخص کُلّی طور پر سائنس کی پیروی کرے تو کیا ممکن ہے کہ اس کو وہی معرفت حاصل ہو جو مذہب کی پیروی کرنے سے ہوتی ہے ؟

(ب، منزلِ مقصود تک رسائی کے لئے سائنس اور مذہب دونوں میں اِتنے محنت طلب تجربوں کی کیوں ضرورت ہے؟

جواب : اگر ایک شخص مذہب کو چھوڑ کر کلّی طور پر سائنس کی پیروی کرتا ہے تو وہ حصولِ معرفت میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا ہے وہ صرف سائنس میں کامیاب ہو سکتا ہے، کیونکہ معرفت دین کی آخری چیز ہے، جو رُوح اور خُدا کی شناخت کو کہتے ہیں، اور سائنس اُس حکمت کا نام ہے جو مادّہ اور جسم

کی تحقیق اور پہچان سے متعلق ہے، اگر سائنس کی مکمّل پیروی سے کسی کو خدا ملتا اور معرفت حاصل ہوتی تو آج دُنیا کی وہ مادّیت پرست قومیں خُدا پرست بن جاتیں، جو سائنس کے میدان میں کافی حد تک کامیاب ہیں، لیکن سب جانتے ہیں کہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔

ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ حق مذہب اور صحیح سائنس ایک دُوسرے کے خلاف نہیں ایک ہیں، اس کے معنی یہ ہُوئے کہ سچّے مذہب کے وسیلے سے رُوح اور خُدا کو پہچان لیا جائے اور درست سائنس کے ذریعے سے مادّہ اور جسم کی حقیقتوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا جائے، تاکہ انسان دونوں جہان کی تمام نعمتوں کو پائے اور کامیاب و کامران ہو۔

مذہب اور سائنس کے ایک ہونے کا اصل مطلب یہ ہے کہ جب ایک سعادت مند انسان کو بصیرت اور دین کی مکمّل شناخت حاصل ہوتی ہے تو وہ اصل سائنس کو دینِ فطرت کے مطابق پاتا ہے، اس میں دینِ حق کی واضح شہادتیں اور روشن دلیلیں موجود ہوتی ہیں، اور ان تمام حقیقتوں کا انکشاف دین شناسی ہی سے ممکن ہے۔

اَب رہا دُوسرا سوال کہ، منزلِ مقصُود تک رسائی کے لئے سائنس اور مذہب دونوں میں اتنے محنت طلب تجربوں کی کیوں ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ منزلِ مقصود جس کو آپ نے تسلیم ہی کر لیا ہے بہت ہی دُور ہے، جس کے لئے سخت محنت درکار ہے، اور دونوں صورتوں میں وہ آخری منزل اِس قدر آرام دہ ہے کہ اُس تک رسائی کے لئے جتنے بھی محنت طلب تجربات کئے جائیں کم ہیں، کیونکہ منزلِ مقصُود بہت ہی بڑی چیز ہے۔

حقیقی مومن :-

سَوال ۵۴ : حقیقی مومن کی کیا کیا نشانیاں ہوتی ہیں ؟
جوَاب : حقیقی مومن کی نشانیاں قرآن سے باہر نہیں، اور وہ ایمانِ کامل اور عملِ صالح ہیں، ایمانِ کامل کا مطلب ہے خُدا اور رسُولؐ کے بعد امامِ حیؑ و حاضر پر ایمان لانا اور جان و دل سے اقرار کرنا، اور عملِ صالح کے معنی ہیں انہی تینوں درجات کے امر و فرمان کے مطابق عمل کرنا۔

اگر مومن کی نشانیاں تفصیل سے دیکھنا ہیں تو کتاب "پیر پندیاتِ جوانمردی" کو پیشِ نظر رکھیں، کیونکہ اداۓ مطلب کے بہت سے طریقے ہیں، مگر معنی ایک ہیں۔

ہم یُوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حقیقی مومن کی نشانیاں امامِ زمان کی محبت اور فرمانبرداری ہیں، جن میں دین کی تمام خُوبیاں آجاتی ہیں، اور ان سے کوئی چیز باہر نہیں۔

ہندو مذہب :-

سَوال ۵۵ : یہاں میرے ایک قریبی دوست نے چند ہندو بزرگوں کا نام لے کر پُوچھا ہے کہ ان کے فلسفے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
جوَاب : میرے بہت ہی عزیز دوست! آپ ہندو مذہب سے اس قدر کیوں متاثر ہوئے ہیں؟ آپ نے سب سے پہلے اسماعیلی مذہب کے

عظیم فلسفے کا گہرا مطالعہ کیوں نہیں کیا ہے؟ پھر مذاہبِ اسلام کا اور آخر میں مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ کرتا، تاکہ آپ کو ایسے غیر ضروری سوال کرنے کی اہمیت باقی نہ رہتی، اور اسماعیلی مذہب کی صداقت و حقیقت روشن ہو جاتی۔

میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ سوالات ہی نہ کئے جائیں، بلکہ میرا کہنا یہ ہے کہ اگر غیر اسماعیلیت کے بارے میں ایسا کوئی سوال کرنا ہے تو اس کے لئے یا تو اسلام کے مختلف مذاہب پر نظر ڈالی جائے یا تمام مذاہبِ عالم پر، اور صرف ہندو مذہب کے بزرگوں کے فلسفے کو اتنی اہمیت کیوں دیں، جبکہ ہندو مذہب اختلافات اور تضادات سے بھرپور گیا گزرا مذہب ہے۔

صراطِ مستقیم :-

سوال ۵۶ : اگر ہمارا مذہب برحق ہے اور یہ ہم کو صراطِ مستقیم پر چلا کر خدا سے ملا دیتا ہے تو لوگوں کو اس کی دعوت و تبلیغ کیوں نہیں کی جاتی ہے، تاکہ مذہبی اختلافات اور تنازعات کے ختم کرنے میں مدد ملے اور خیر خواہی کا فریضہ انجام پائے؟

جواب : (الف) قرآن اور اسلام کی جو دعوت ہے وہ حکمت کی زبان میں اسماعیلیت کی دعوت ہے جو رسول اللہؐ کے زمانے سے قیامت تک دُنیا میں جاری ہے، اب دینِ حق کی اس عملی دعوت کو قبول کر کے معلّمِ قرآن سے رجوع کرنا لوگوں ہی کی ذمّہ داری ہے۔

(ب) جب اسلام اور اسماعیلیت لوگوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں، وہ ہمیشہ اس کو موضوعِ بحث بنا لیتے ہیں تو پھر دعوت کے کیا معنی، اگر وہ آج اسماعیلی

مذہب کو بُرا مانتے ہیں تو کیا کل قیامت کے دن وہ یہ عُذر بھی کر سکیں گے کہ وہ دُنیا میں اس مذہب سے بے خبر تھے؟

(ج) اس کے علاوہ ہمارے پیروں اور بزرگوں نے اپنے اپنے وقت میں امامِ زمان کے امر و فرمان کے مطابق بھرپُور علمی کوششیں بھی کی ہیں، یعنی بہت سے لوگوں کو دینِ حق سے روشناس کر دیا ہے، جس کا اصل مقصد مخالفین کے حملوں سے دین کو بچانا اور مضبُوط کرنا تھا نہ کہ دعوت کے سلسلے میں لوگوں پر اتمامِ حُجّت۔

(د) حدیث ہے کہ: بندوں پر توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا یہاں تک کہ سُورج مغرب سے طلوع ہو جائے۔ جاننا چاہئے کہ لوگوں کے لئے توبہ کا دروازہ دعوتِ حق ہے جو قیامت کے قریب بند ہو جانے والی ہے۔

(ہ) اگر اس سوال کا مطلب یہ ہو کہ علم و عمل کے ذریعے سے اسماعیلی مذہب کی تمام تر خُوبیاں لوگوں پر ظاہر کیوں نہیں کر دی جاتی ہیں تاکہ اسلام کی حقیقی ہدایت روشن ہو جائے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دینِ حق کی تمام خُوبیوں کا مجموعہ امامِ زمان ہے اور وہ دُنیا والوں کے سامنے ظاہر اور آشکار ہے، پھر اس کے بعد کون سی چیز پوشیدہ رہتی ہے۔

ناندی کی حکمت:-

سوال ۵۷: ہم جماعت خانے میں ناندی کیوں لاتے ہیں؟ کیا یہ درست نہیں کہ ہم بجائے جنس کے نقد پیش کریں؟

جواب: اگرچہ اس کے لئے نقد کی بھی اجازت ہو سکتی ہے لیکن

ناندی کی حکمت یہ ہے کہ خُدا کے گھر میں اس کے لانے سے بندۂ مومن کی طرف سے ادب، تعظیم اور عاجزی کا مظاہرہ ہوتا ہے، جس سے پُرخلوص غلامی کا ثبوت ملتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس سے کچھ ضرورت مندوں کی ضرورت بھی پُوری ہو جاتی ہے، لہٰذا اس میں نہ صرف انفرادی اعتبار سے دینداری کی فضیلتیں پوشیدہ ہیں بلکہ جماعتی لحاظ سے بھی یہ کام باعثِ برکت ہے۔

زمانۂ جدید کے بعض تعلیم یافتہ نوجوان ناندی جیسی رسومات سے کیوں شرم محسوس کرتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ وہ خُدا کے گھر میں خرید و فروخت کا معاملہ پسند نہیں کرتے؟ حالانکہ بیعت بھی جانوں کی خرید و فروخت ہے، اور قرآن میں مومنین کی جان و مال کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ سودا ہو جانے کا ذکر ہے (۹/۱۱۱) پس ایسا خالص دینی، اُخروی اور مُقدّس سودا خُدا کے گھر میں نہ ہو تو کہاں ہونا چاہئے۔

نادِ علی:۔

سوال ۵۸: "نادِ علی" کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

جواب: نادِ علی اور اس کا ترجمہ ذیل کی طرح ہے:۔

نادِ عَلِیًّا مَظْهَرَ الْعَجَائِبِ
تَجِدْهُ عَوْنًا لَکَ فِی النَّوَائِبِ
کُلُّ هَمٍّ وَغَمٍّ سَیَنْجَلِی
بِوِلَایَتِکَ یَا عَلِی یَا عَلِی

علی کو پُکار جو (خُدا کے) عجائب کا مظہر ہے، تُو اُس کو مصیبتوں میں

اپنا مددگار پائے گا، وہ ہر تکلیف اور غم کو زائل کر دے گا، اپنی ولایت کی حرمت سے یا علی یا علی۔

تعجب ہے:۔

سوال ۵۹ : اللہ کیوں ہے؟

جواب : اس میں کوئی شک نہیں کہ سوالات مختلف قسم کے ہُوا کرتے ہیں، اچھے بُرے، موافق مخالف، اور انوکھے نرالے، مگر یہ سوال سب سے عجیب ہے، اس میں تعجّب اِس لئے نہیں کہ خُدا تعالےٰ کی ہستی سے انکار کیا گیا ہے، بلکہ عجیب بات تو یہ ہے جو کہا گیا ہے کہ "خُدا ہے مگر کیوں؟"

اس میں ہمارے تعجب کی خاص وجہ یہ ہے کہ جب خُدا کے وجود کو مانا گیا تو لازمی طور پر ان تمام اوصاف کے ساتھ مانا جاتا ہے، جو اس کے لئے بیان کئے جاتے ہیں، تو پھر "اللہ کیوں ہے" کا سوال ختم ہو جانا چاہیئے، جبکہ خُدا کے ہر وصف میں اس کا مکمل جواب موجود ہے، مثلاً: اللہ اس لئے ہے کہ وہ خالق ہے، اس لئے کہ وہ رازق ہے، اس لئے کہ وہ مَلِک (بادشاہ) ہے، اس لئے کہ وہ ربّ ہے، اِس لئے کہ وہ رحمٰن ہے وغیرہ۔

مطلب یہ ہے کہ خُدا تعالیٰ کے سَو ناموں میں سے ہر ایک نام خُدا کی ہستی کی ضرورت و اہمیّت کی ایک روشن دلیل ہے، اور جو لوگ خُدا کے وجود کے لئے قائل ہو جاتے ہیں، وہ سب سے پہلے اس فلسفے کو خُوب سمجھتے ہیں کہ "خُدا تعالیٰ کو کِس لئے ہونا چاہیئے"۔

انسانی حقیقت :-

سَوال ۶۰ : ہم شروع میں خُدا تعالیٰ سے کیوں الگ یا جُدا ہو گئے ؟ اس کی وجہ اور مقصد کیا ہے ؟

جَواب : اِس سلسلے میں آپ کے علم میں جو بھی باتیں آگئی ہیں وہ دینی تعلیمات کی ابتدائی باتیں ہیں، اور حق بات تو یہ ہے کہ ہم اپنی اصل انا میں خُدا سے جُدا نہیں ہُوئے ہیں اور یہ سب سے بڑا خدائی بھید ہے کہ انسان کی سب سے اُونچی حقیقت انائے عُلوی اپنے اصل مقام سے نیچے نہیں آتی ہے بلکہ اس کا ایک سایہ یہاں تک آیا ہے، سایہ سے مُراد نچلے درجے کی خودی ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ انسان کیا ہے وہ عالمِ کثرت میں ایک جسم ہے، عالمِ ارواح میں ایک رُوح ہے، عالمِ عقول میں ایک عقل ہے اور عالمِ حقائق میں ایک حقیقت ہے، ہم عالمِ حقائق کو عالمِ وحدت بھی کہہ سکتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی اعلیٰ ترین حقیقت ازل میں جیسی تھی اَب بھی ویسی ہے، کیونکہ وحدت سے وحدت جُدا نہیں ہوتی ہے اور نہ حقیقت سے حقیقت جُدا ہو سکتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہُوا کہ MONOREALISM (ایک حقیقت) کا نظریہ صحیح ہے، جس کے مُطابق دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی خودی کم سے کم دو درجوں میں ہے ایک درجۂ ادنیٰ ہے جو ظاہری اور جسمانی ہستی ہے اور دوسرا درجۂ اعلیٰ ہے جو انائے عُلوی اور حقیقتِ واحدہ ہے جو ہمیشہ اصل مقام پر قائم ہے، پس انسان اپنی ظاہری شخصیت کے اعتبار سے اِس دُنیا میں آیا ہے

لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ عالمِ وحدت میں ہے۔

نیاز اور فرشتہ:-

سوال ۶۱: کیا یہ عقیدہ دُرست ہے جو مانا جاتا ہے کہ نیاز (یعنی آبِ شفا) کے موقع پر کچھ فرشتے حاضر ہوتے ہیں؟

جواب: ہاں، بالکل دُرست ہے، آپ علم الیقین کی روشنی میں فرشتوں کے وجود اور ان کے کاموں کی حقیقت کو بخوبی سمجھ لیں تو معلوم ہو جائے گا، کہ جس جگہ عبادت و بندگی اور عقائد کی تعمیل ہوتی ہے وہاں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے ہمیشہ حاضر ہُوا کرتے ہیں، اور جہاں نُورِ الٰہی ہوتا ہے وہاں فرشتے بھی موجود رہتے ہیں۔

تقیّہ:-

سوال ۶۲: اگر عیسائی اپنے دین کی ہر بات کو ظاہر کرسکتے ہیں تو ہم اپنے مذہب کے عقائد کو کیوں ظاہر اور آشکار نہیں کرسکتے ہیں؟

جواب: (الف) یہ کیونکر ضروری ہوسکتا ہے کہ جو طریقہ عیسائی اختیار کریں تو ہم بھی اسی پر چلیں، اور اسلام کے بُنیادی اُصولوں کو نہ دیکھیں۔

(ب) ہمیں بعض عقائد میں تقیّہ سے کام لینے کی ضرورت ہے، تقیّہ ہمارا دین ہے ہمارے اماموں کا دین ہے اور یہ رسُولِ برحق کا دین ہے جو اسلام ہے۔

(ج) قرآن و سُنّت اور پاک ائمہ کی مثالی زندگی میں ذرا غور سے دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ دینِ اسلام کی بہت سی باتوں میں اُصولِ تقیہّ کارفرما ہے اور تقیہّ کرنا بہتر ہے، کیونکہ اسی میں ہر طرح کی سلامتی ہے۔

(د) اسلام دینِ فطرت ہے لہٰذا اس کا قانُون کائنات و موجودات کا قانُون ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر چیز اور ہر مخلوق کو گاہ بگاہ کے خطرات سے بچانے کی تدبیر کی گئی ہے چُنانچہ تقیہّ کا مطلب ہے دین کی ایسی باتوں کو ظاہر نہ کرنا جن کی وجہ سے مومنین کو خطرہ پیدا ہو جاتا ہو اور امام کے مریدوں کو غیر ضروری تکلیف پہنچتی ہو۔

(ہ) ہمیں اپنے اعمال و اقوال کو امامِ زمان کے مُقدّس امر و فرمان کے سانچے میں ڈھالنا چاہیئے، نہ کہ کُورانہ تقلید کے لئے دُوسروں کی طرف دیکھنا چاہیئے، جبکہ ہمارے پاس نورِ ہدایت موجود ہے، جو کسی کے پاس نہیں۔

(و) شروع سے لے کر اب تک ہمارے بھائیوں اور بہنوں کے جو جو سوالات ایسے آئے ہوں کہ ان کا معیار غیر اسماعیلی عقیدہ ہے، تو وہ سوالات ہی بُنیاد سے غلط ہیں، یعنی غیروں کے کسی عقیدے کو دیکھ کر یہ پُوچھنا کہ "فلاں مذہب میں یہ ہے ہمارے یہاں کیوں ایسا نہیں" ہرگز درست نہیں، جس کی وجہ اُوپر بتائی گئی ہے۔

نُورِ واحد:-

سوال ۶۳: قرآنِ مُقدّس خُدائی نور ہے، اور حاضر امام بھی ایسا ہی ہے، لیکن نوُر ناقابلِ تقسیم ہے، سو ہمارے پاس دو نور کیسے ہُوتے ہیں.....

جواب: آپ کے سوال کا جو حصّہ درست تھا وہ مَیں نے یہاں لکھ دیا ہے اور اسی میں آپ کا مطلب بھی آگیا ہے اور دُوسرے الفاظ اُلجھے ہوئے تھے لہٰذا میں نے ان کو چھوڑ دیا ہے، اور اِس سوال کا جواب ذیل کے نقشہ کے مطابق ہے:۔

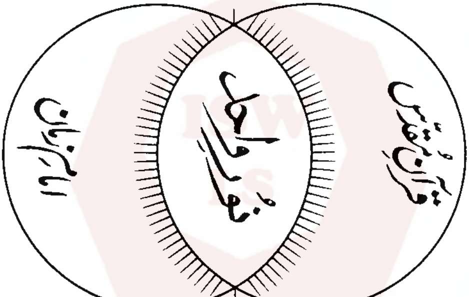

یہ ایک معجزانہ نقشہ ہے جو خصوصی عطیات میں سے ہے، اور اس میں دیکھنے سے علم و حکمت کے بہت سے بُنیادی اصولات کا پتا چلتا ہے، چُنانچہ اِس سے یہ حقیقت صاف طور پر روشن ہو جاتی ہے کہ نور ہمیشہ کے لئے ایک ہی ہے، وہ قرآنِ مُقدّس اور امامِ زمانؑ کے درمیان ہے، اِس لئے یہ دونوں پاک ہستیوں (یعنی قرآن اور امام) میں مشترک ہے۔

اگرچہ نور ایک لحاظ سے قرآنِ پاک اور امامِ برحق میں مشترک ہے لیکن دوسرے لحاظ سے نور کا زیادہ سے زیادہ تعلق امامِ حیؑ و حاضر سے ہے، کیونکہ نور بولتا ہے اور وہ ایک زندہ روح ہے، اور وہ امامت ہی کی رُوح ہے اور امام کا نور ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۵/۱۵)

تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور ظاہر کتاب آچکی ہے۔ اِس فرمانِ خُداوندی سے ظاہر ہے کہ نور بہ حقیقت پیغمبرؐ اور امامؑ ہیں اور کتابِ مُبین

قرآن ہے، اگر قرآن ہی ذاتی طور پر نور ہوتا تو اس کو "کتابِ مُبین" کہہ کر نور کا الگ ذکر نہ کیا جاتا۔

اِس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کتابِ مبین ہے اور امامِ زمان نور، کیونکہ نور ایک ہی ہے دو نہیں، اور اگر ہم قرآن کو بھی نور کہنا چاہتے ہیں تو وہ اِس معنیٰ میں درست ہے کہ قرآن کی زندہ رُوح امام میں رہتی ہے اور امام ہی میں بول سکتی ہے ورنہ نہیں، نقشہ میں خُوب غور سے دیکھ کر اس مطلب کو سمجھو۔

درجۂ عارف :-

سوال ۶۴ : اگر ایک آدمی انتہائی معرفت کو پہنچتا ہے اور وہ نور کو حاصل کرتا ہے، اور وہ کسی پیر پیغمبر اور قرآن کی طرح ہو جاتا ہے تو کیا وہ اس وقت انا الحق (مَیں خدا ہُوں) کہہ سکتا ہے یا نہیں ؟ اگر وہ اُس آخری درجے تک پہنچ سکتا ہے تو اس کا امام سے کیا رشتہ ہوتا ہے ؟ اس میں وہی خدائی نُور ہونے کے باوجود، جو امام میں ہے، وہ خود کو امام کے طور پر ظاہر نہیں کر سکتا، لیکن وہ (نور کے اعتبار سے) وہی درجہ رکھتا ہے، جیسے امام کا یا کسی پیغمبر کا، تو وہ اپنی امامت کا اعلان کیوں نہیں کر سکتا، محض اس لئے نا، کہ وہ نورانی فیملی (خاندانِ امامت) میں پیدا نہیں ہُوا ہے، اور اگر یہی واقعہ ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہُوا، حالانکہ خُدا تعالیٰ پاک اور رحمان و رحیم اور عادل ہے، تو پھر ان دونوں مظہروں کے درمیان یہ امتیازی سلوک کیوں روا رکھا گیا ہے ؟

جواب : یہ درست ہے کہ ایک حقیقی مومن ہادیٔ برحق کی ہدایت کی روشنی میں کمالِ معرفت کو پہنچتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ نور کو حاصل کرتا

ہے، مگر نور کی اصل میں واصل ہو جاتا ہے نہ کہ اس سے الگ اور جُدا کوئی نور حاصل کرتا ہے، کیونکہ نور تقسیم نہیں ہوتا ہے جیسا کہ سوال ۶۳ کے تحت اس کا نقشہ دیا ہُوا ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ پیر پیغمبر کی رُوحانیت کی پیروی کرتے کرتے آگے سے آگے چلا جاتا ہے، اور کوئی شک نہیں کہ اس دوران قرآن کی مکمل رُوحانیت کو بھی پاتا ہے، لیکن یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ "انا الحق" کا چیخ چیخ کر نعرہ لگانا بھی اس سلسلے کا ایک ضروری معجزہ ہے، حالانکہ یہ کلمہ منصور حلاج کے ذاتی جذبے کا نتیجہ ہے، آپ ہر عارف کی معرفت کو صرف اسی انا الحق کے معیار سے پرکھنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ بحیثیتِ مجموعی علم وعرفان کو دیکھیں۔

عارف کا امام سے رشتہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امام کے نُور سے واصل ہو جاتا ہے، اس میں وہی خُدائی نور امام سے الگ نہیں ہوتا بلکہ وہ خُدا کے نُور سے (جو امام میں ہے) امام ہی کے وسیلے سے جاملتا ہے، اس میں کوئی دُوسرا نُور کہاں سے آیا یا اصل نور دو حصّوں میں کب تقسیم ہُوا کہ جس کی بناء پر یہ عارف دعویٰ کرے کہ یہ بھی ایک امام بن گیا ہے؟ سوال کا یہ حصّہ بچگانہ ہے، آپ خوب سوچیں کہ اگر لوہے کا ایک ٹکڑا آگ میں رہ کر آگ بن سکتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ آگ سے الگ ہو کر بھی یہ دعویٰ کرے کہ مَیں آگ ہُوں، یہ دعویٰ دُرست نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ لوہا آگ ہے تو آگ کی بدولت ہے، آگ کے وسیلے سے ہے اور آگ کے اندر رہ کر صحیح ہے کہ وہ آگ ہونے کا دعویٰ کرے۔

دُوسری مثال اُس غریب آدمی کی طرح ہے جو بادشاہ کا دوست بن جاتا ہے، بادشاہ رفتہ رفتہ اس پر بادشاہی کے تمام بھیدوں کو کھول دیتا ہے جس کا مقصد اس کو بھیدی بنانا ہے نہ کہ اس کو فی الفور تخت پر بٹھانا ہے، اس

صورت میں اگر غریب آدمی ایک الگ بادشاہ بن جانے کی خواہش کرتا ہے تو بالکل غلط ہے، اگر وہ سوچتا ہے کہ وہ بادشاہ کا اتنا قریبی دوست ہو گیا ہے کہ بادشاہ گویا اس کی جان ہے اور بادشاہ اس کا ایک رُوپ ہے، لہٰذا یہ غریب شخص تصور کر سکتا ہے کہ وہ بادشاہ کی رُوح میں مل کر بادشاہ بن گیا ہے نہ کہ وہ بادشاہ سے الگ کوئی بادشاہ ہو گیا ہے۔

یہ فرق کیوں؟

سوال ۶۵ : کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ صراطِ مستقیم پر آگے ہیں اور کچھ پیچھے، لیکن خُدا کے نزدیک سب بچے برابر ہیں، تو پھر کچھ لوگ دُوسروں سے پیچھے کیوں ہیں؟

مذہبی عقائد بچپن ہی میں پختہ ہو جاتے ہیں اور ایک آدمی ۱۸۔ ۲۵ برس کی عمر سے پہلے ہی مذہب کو اس کی گہرائی کی تحقیق کے بغیر اپنا لیتا ہے، پھر وقت اور موقع گزر جاتا ہے اور وہ اپنے مذہب کو تبدیل نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ مذہب رکھتا ہے وہی صحیح ہے، اس صورت میں اس کو رُوحانی عذاب کیوں ملنا چاہئے، جبکہ اُس نے ایسے لوگوں کے کہنے پر عمل کیا جن کو یقین تھا کہ وہ سچے ہیں؟

جواب : ہاں، درست ہے کہ قرآن و حدیث اور عقل و منطق کی نظر میں کچھ لوگ صراطِ مستقیم پر آگے ہیں اور کچھ پیچھے، کیونکہ جب دین خُدا کی طرف چل کر نزدیک ہو جانے اور منزلِ نجات حاصل کرنے کا راستہ ہے تو لازمی ہے کہ نتیجے کے طور پر کچھ لوگ آگے بڑھیں کچھ پیچھے رہیں اور بعض

بھٹک جائیں۔

جب آپ قبول کرتے ہیں کہ دینِ حق کی جو مثال راہِ راست سے دی گئی ہے وہ بالکل صحیح ہے، تو پھر آپ راہِ دین (صراطِ مستقیم) کے لوازم، نتائج اور عواقب کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں، اور وہ یہ ہیں کہ اہلِ مذاہب سب کے سب اسی راہ کے مُسافر ہیں، چونکہ وہ ہادئ برحق کی پہچان، فرمانبرداری، سامانِ سفر اور ہر قسم کی تیاری کے لحاظ سے ایک جیسے اور برابر نہیں ہیں، اس لئے ان مذہبی مُسافروں میں سے کچھ تو اگلی منزلوں میں پہنچے ہُوئے ہیں، کچھ پچھلی منزلوں میں ہیں اور بعض بھٹک بھی گئے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ فرشتہ کو نفس نہیں صرف عقل دی گئی ہے، حیوان کو عقل نہیں صرف نفس دیا گیا ہے، اور انسان کو مذکورہ دونوں مخلوق کے درمیان رکھ کر بطورِ امتحان و آزمائش کے دونوں قوتیں عطا کر دی گئی ہیں، یعنی انسان میں عقل بھی اور نفس بھی، اور یہ روشن حقیقت ایسی معروف و مشہور ہے کہ اس سے کسی کو ہرگز انکار نہیں۔

جب اِس میدانِ علم و عمل میں انسان کو آزمانا مقصُود تھا اور جس کے لئے اُسے عقل و نفس کی دو متضاد قوتیں دی گئیں تو اس کے ساتھ ساتھ رحمتِ خُداوندی کا یہ تقاضا ہُوا کہ انسان کو ایک تیسری قوّت بھی عنایت کی جائے تاکہ جس کے ذریعے سے انسان عقل و نفس دونوں پر بادشاہی کر سکے، وہ قوتِ ارادہ یعنی اختیار کی تھی، اور یہاں ارادہ و اختیار کا مطلب ہے عقل اور نفس کی فرمائشوں میں سے کسی ایک کو چاہنا اور پسند کرنا، اگر انسان کو اپنے علم و عمل کے مطابق اختیار حاصل نہ ہوتا تو امتحان و آزمائش کا سوال ہی ختم ہو جاتا اور اس کی ذات میں دو مخالف طاقتوں کا ہونا بے معنی ہو کر رہ جاتا۔

جب انسان کا اختیار اور امتحان ثابت ہُوا تو اس کے نتائج بھی لازمی ہو گئے، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان نہ صرف تمام حیوانات پر بادشاہی کرے بلکہ وہ فرشتوں سے بھی افضل و اعلیٰ قرار پائے، اور دُنیاوی طور پر بھی کسی سے بار بار امتحان لینے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کو فضیلت و مرتبت میں آگے سے آگے بڑھا دیا جائے، لیکن اس سلسلے میں بہت سے لوگ ناکام بھی ہو جاتے ہیں۔

جہاں سارے انسانوں کی مثال خُدا کے اہل و عیال کی طرح ہے تو وہ صرف اس معنیٰ میں صحیح ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ باپ کی طرح بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ لوگوں کی بھلائی اور بہتری چاہتا ہے، اب آپ نے خود ہی باپ بیٹوں کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے، تو پھر اصول سے ہٹ کر ہرگز بات نہیں کرنا، اور وہ یہ کہ کسی باپ کے سارے بچے علم و ہنر میں اور امر و فرمان کی پابندی میں ایک جیسے تو نہیں ہو سکتے، کچھ فرمانبردار ہوتے ہیں اور کچھ نافرمان، اور یہ لازمی بات ہے کہ باپ کچھ بچوں سے راضی اور کچھ سے ناراض ہو اور جیسے خُدا ایک مہربان اور خیر خواہ باپ کی طرح یہ نہیں چاہتا ہے کہ لوگ قانونِ قدرت کی خلاف ورزی کریں ویسے وہ ان کے غلط کاموں کی سزا سے بھی خوش نہیں، لیکن قانونِ فطرت جو خود کار قسم کا ہے خود بخود ہر قسم کے اعمال کا بدلہ دیتا رہتا ہے۔

آپ کا یہ نظریّہ غلط ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "مذہبی عقائد بچپن ہی میں پختہ ہو جاتے ہیں"۔ جبکہ عقیدہ ابتدائی ایمان کا نام ہے اور پختہ عقیدہ کی مُراد ایمانِ کامل ہے، اس کے یہ معنی ہوتے کہ عقیدہ کی اصلاح اور ایمان کی درستی و تکمیل کی مہلت موت کے وقت آنے تک ہے، کیونکہ بچپن کا عقیدہ تقلید کی بُنیاد پر قائم ہوتا ہے اور عقل و دانش کی پختگی کے بعد اس میں تحقیق کا تقاضا

پیدا ہو جاتا ہے، سو یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے دین کی ہر بات میں اور ہر کام میں غور و فکر کے لئے زور دیا ہے، یہ دینِ اسلام کی وہ پُر حکمت دعوت ہے جو تقلید سے تحقیق کی طرف آنے کے لئے مقرر کر دی گئی ہے۔

اِس سوال میں ایک ہی مطلب کو مختلف الفاظ میں دہرایا گیا ہے اور اپنی کم علمی یا سادگی کی وجہ سے غیر منطقی باتوں کی دلیل بنانے کی کوشش کی گئی ہے مثال کے طور پر یہ کہنا، "جبکہ اُس نے ایسے لوگوں کے کہنے پر عمل کیا جن کو یقین تھا کہ وہ سچے ہیں،" آپ خود بھی اس میں ذرا غور کریں، آیا ہم اِس بات کو حقیقت مانیں یا لوگوں کی ایک عام عادت کہ دُنیا کے تمام مذاہب والے اپنے اپنے نظریات کو برحق مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو یقین ہے کہ ہماری بات سچ ہے، اور اگر لوگوں کا یُوں کہنا کوئی دلیل ہے تو پھر تمام مذاہب حق پر ہیں، مگر یہ بات ممکن نہیں۔

دُنیا میں تکالیف کیوں؟:-

سوال ۶۶: خُدائے قدوس جب رحمان و رحیم اور جواد و کریم ہے تو پھر اِس دُنیا میں ایسی بہت سی تکالیف کیوں ہیں؟ بچّوں میں غربت و ناچاری کیوں ہے؟ اور جنگوں کا وجود کیوں ہے؟

جواب: (الف، اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی جتنی تعریف و توصیف کی جائے کم ہے، کیونکہ تمام الٰہی علم و حکمت اور سارا قانونِ قُدرت اسمائے خُداوندی میں ہے جس کی تفصیل قرآنِ مُقدس ہے، اور دُنیائے انسانیت میں جس قدر تکالیف پائی جاتی ہیں وہ خُدا کی ذات و صفات کی خُوبیوں کی نفی نہیں کرتی ہیں اور نہ ہی یہ قرآنی حکمت کے خلاف ہیں۔

(ب) آپ نے بالغ انسانوں کو چھوڑ کر معصوم بچّوں کی غربت وناچاری اور بیماری کا سوال اس لئے اُٹھایا ہے تاکہ ہم بڑوں کے بارے میں یہ کہہ کر جواب کو نہ ٹالیں کہ یہ ان کے گناہوں کی سزا ہے، جبکہ چھوٹے چھوٹے بچّے بے گناہ ہوا کرتے ہیں، سو آپ کا پُوچھنا درست ہے، مگر یہ یاد رہے کہ تکلیف ہر بار گناہ کی وجہ سے نہیں آتی ہے، وہ بعض دفعہ اس کے بغیر کسی اور مصلحت کی بناء پر بھی آسکتی ہے، انبیاء علیہم السّلام کی مُقدّس زندگی پر غور کریں، کیا وہ حضرات بچّوں سے بھی زیادہ پاک وپاکیزہ نہیں تھے؟ کیا ان کو (نعوذ باللہ) اگلے جنم کی بداعمالی کی سزا مل رہی تھی؟ اُنہوں نے انسانوں میں سب سے زیادہ تکلیف ومشقت کیوں اُٹھائی؟ اس باب میں خُوب غور کیا جائے۔

(ج) یہ بھی یاد رہے کہ حکمتِ قرآن کے مطابق ایک ہی چیز کے کئی نام ہو سکتے ہیں، جیسے دُنیاوی طور پر کسی سے کوئی نقد وجنس لینے کا نام جرمانہ بھی ہو سکتا ہے اور تحفہ بھی، اور یہ معاملہ جن کے درمیان ہو اور جن افراد کو اس کا علم ہو وہی بخوبی جانتے ہیں کہ جو کچھ لیا گیا وہ تحفہ کے طور پر تھا یا جرمانہ کی صورت میں، اسی طرح کوئی تکلیف ومصیبت نہ صرف سزا ہی ہو سکتی ہے، بلکہ بعض حالات میں یہ بندگی اور قربانی بھی ہو سکتی ہے۔

(د) دونوں جہان کا کوئی بادشاہ ہے اور وہی خُدا ہے، اسی کی بادشاہی اور خدائی میں یہ سب کچھ ہے اور ہونا چاہئے، اور اگر حکمت کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ نہ تو بیماری اور تکلیف فضول ہے اور نہ ہی وہ جنگیں جو قُدرتی طور پر ہُوا کرتی ہیں، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ بیماری کا علاج نہ کیا جائے، تکالیف کو دُور کرنے کے لئے عقل ودانش سے کام نہ لیں اور جنگیں ہر حالت میں عبادت قرار دی جائیں، بلکہ بہت سی تکالیف کو ختم کر دینے کے لئے

کوشش ضروری ہے، اور اگر ممکن نہ ہو تو اسے قُدرتی قرار دے کر سمجھ لیا جائے کہ حکمت و مصلحت اسی میں ہے۔

(ہ) اِنسانی زندگی ایک عجیب و غریب شے ہے اور اس کے کئی کئی پہلو ہیں کیونکہ انسان نہ صرف اپنے آپ میں زندہ ہے بلکہ وہ دُوسروں میں بھی جیتا ہے، وہ اگرچہ محدُود نظر میں ذاتی اور انفرادی طور پر زندگی بسر کرتا ہے، اور ہر چند کہ اس کے خیالات و افکار اور اقوال و افعال کی ایک چھوٹی سی الگ دُنیا ہے، جس کا حساب کتاب جُداگانہ اور ذاتی نوعیت کا ہُوا کرتا ہے، تاہم اِس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کی ایک گھریلو اور خاندانی زندگی بھی ہے، جس کا یہ حال ہے کہ کبھی تو وہ اہلِ خانہ کی وجہ سے تکلیف اُٹھاتا ہے اور کبھی ان کے سبب سے راحت پاتا ہے اور اس میں تعجّب کیوں ہونا چاہئے کہ یہ خاندانی وحدت و سالمیت ہے اور گھر کے افراد ایک دُوسرے کے اعضاء و اجزا کی مثال پر ہیں، یہی مثال اہلِ حکمت کے نزدیک انسان کی اُس زندگی کی بھی ہے جو وہ قصبہ، شہر اور ملک والوں کے ساتھ مل کر گزارتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر درجہ کی اجتماعی زندگی کے مسائل سے لاتعلق اور بے غرض نہیں رہ سکتا، اور نہ ہی وہ اپنے ملک و ملت کی مجموعی اچھائی یا بُرائی کے نتائج و عواقب سے الگ تھلگ ہو سکتا ہے۔

(و) اسی طرح ہر معتقد انسان کی ایک جماعتی اور مذہبی زندگی بھی ہے، اور ہر قسم کے لوگوں کی سب سے آخری اور سب سے عظیم زندگی وہ ہے جس میں تمام لوگوں کو طوعًا و کرھًا رجوع ہو جانا ہے (۳/۸۳) اور وہ ایسی کُلّی زندگی ہے کہ جس میں ازل سے ابد تک پائے جانے والے تمام نفوسِ خلائق ایک ہی ہیں (۵۶/۴۹-۵۰) چُنانچہ ارشادِ خُداوندی ہے کہ:۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱/۲۸) تم سب کا ازل

میں)، پیدا کرنا اور (ابد میں)، جِلا اُٹھانا ایک جان (یعنی نفسِ کلّی) کی طرح ہے۔ یعنی تم سب رُوحِ کُلّی میں ایک ہی ہو، اور اگر تُم اپنے آپ میں چشمِ یقین پیدا کرو گے تو دیکھو گے کہ تم رُوح کا صرف ایک ہی قطرہ ہونے کے باوجود نفسِ کُلّی کے سمندر میں کس طرح ایک ہو۔

مذکورۂ بالا بیان کا خلاصۂ مطلب یہ ہُوا کہ دینی اور دُنیاوی اعتبار سے آدمی کی انفرادی اور ہر درجہ کی اجتماعی زندگیوں کے کارناموں کی تکمیل بغیر تکالیف کے ناممکن ہے، کیونکہ دُنیا و آخرت میں انسان کے لئے سب سے زیادہ خوشی اور سب سے بڑا فخر اس بات میں ہے کہ وہ خُدا کی راہ میں سخت سے سخت مشقتیں برداشت کرے اور اس کی مخلوق کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں پیش کی جائیں، اس لئے کہ اگرچہ خُدا ناشناسی کی سنگین سزا اپنی جگہ پر حق ہے تاہم آخرکار ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے کہ جس میں ہر مذہب کے لوگ خُدا کی بے پناہ رحمت میں باہم ملنے والے ہیں۔

شریعت :-

سوال ۶۷ : کیا یہ بات دُرست ہے کہ جب کوئی آدمی طریقت یا حقیقت کی منزل میں پہنچتا ہے تو شریعت سے بے نیاز ہو جاتا ہے؟

جواب : نہیں نہیں، یہ بات دُرست نہیں ہے، کُلّی طور پر شریعت کو ترک کر دینا کہیں بھی نہیں ہے، کیونکہ دین کی ہر چیز کی تخلیق شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے چار عناصر سے ہے، مگر یہ بات ضرور ہے کہ اگر کسی چیز میں شریعت کا عنصر زیادہ ہے، تو دُوسری میں طریقت کا عنصر غالب ہے،

تیسری میں حقیقت کا اور چوتھی میں معرفت کا پہلو زیادہ ہے، اِس مطلب کی وضاحت کے لئے آپ میری ایک کتاب "آٹھ سوال کے جواب" کے آخر میں دیکھیں۔

امامت اور عورت :-

سوال ۶۸ : اس کی کیا وجہ یا کیا تاویل ہے کہ انبیاء اور آئمہ علیہم السّلام ہمیشہ مردوں میں سے ہُوئے ہیں، اور کسی بھی زمانے میں کوئی عورت مرتبۂ نبوّت یا درجۂ امامت سے سرفراز نہیں ہُوئی؟

جواب : قطعی جواب سے پیشتر عورت کے لئے دینِ اسلام میں جو مقام ہے اس کی طرف کچھ اشارے کئے جاتے ہیں کہ یہ بات اُن روشن حقیقتوں میں سے ہے جن کے بارے میں کوئی شک ہی نہیں کہ وہ ذات عورت ہی تھی، جس نے انبیائے کرام اور آئمۂ عظام علیہم السّلام کو جنم دیا، وہی اُن پاک و پاکیزہ ہستیوں کی جسمانی اور اخلاقی تربیت و پرورش کا مقدّس فریضہ انجام دیتی رہی، اور اُسی نے دُنیا بھر کی ماؤں میں سے ایک افضل ترین ماں کی حیثیت سے اُن کامل انسانوں کو، جو آگے چل کر لوگوں کی رہنمائی اور دستگیری کرنے والے تھے، اپنے پاک دامن میں اُٹھایا اور انتہائی شفقت و محبّت کے ساتھ سینے سے لگا لیا۔

کتنی خوش قسمت اور عظیم المرتبت تھیں وہ بزرگ اور قابلِ قدر مائیں جن کی اولادوں میں سے کوئی پیغمبر یا زمانے کا امام ہُوا، وہ خواتین بھی کس قدر نیک بخت، سعادت مند اور خُداوند تعالیٰ کی برگزیدہ تھیں، جن کو پیغمبروں یا اماموں کی رفیقۂ حیات ہونے کا عظیم ترین شرف حاصل تھا، اور ان حضرات کی بہنوں اور

بیٹیوں پر بھی پروردگارِ عالم کا کتنا بڑا فضل و کرم اور احسان تھا کہ وہ آسمانی علم و حکمت کے سرچشمہ کے انتہائی قریب رہتی تھیں۔

ایک مفید مشورہ تو یہ ہے کہ آپ خود قرآن حکیم کے اُن ارشادات کا ذرا غور سے مطالعہ کریں جو حضرتِ موسیٰؑ کی والدۂ محترمہ اور حضرتِ عیسےٰؑ کی مادرِ مشفقہ (بی بی مریمؑ) کے بارے میں ہیں کہ کس طرح عورت ذات پر نزولِ وحی ممکن ہُوا اور اُس سے فرشتوں نے کیسے کلام کیا، تاکہ آپ کو دینِ فطرت میں عورت کے مقام اور رُوحانی ترقی کا اندازہ ہوسکے۔

عالمِ اسلام میں اہلِ بیتِ اطہار یعنی پنجتنِ پاک صلوات اللہ علیہم کی عظمت و بزرگی اور تقدّس و پاکیزگی ایک مسلّمہ حقیقت ہے، جس کے بارے میں کسی بھی نیک باطن مُسلمان کو ذرّہ بھر شُبہ نہیں، اور ظاہر ہے کہ پاک پنجتن میں سے ایک عالی گوہر فرد خاتون بھی ہے، جس کا مُبارک نام فاطمۂ زہرا اور لقب خاتونِ جنّت ہے، آپ صلوات اللہ علیہا نورِ عالمِ قدسی کے ظہور کا وہ عالی شان نمونہ اور جمالِ اخلاقِ خُداوندی کا ایسا پاکیزہ ترین آئینہ تھیں، جو کسی اولیائی درجے کی باکرامت خاتون کی جسمانیت و بشریت میں ممکن ہے، تاکہ اس کی معرفت سے دیندار، پاک باطن اور فرشتہ سیرت خواتین کی خاطر خواہ ہمّت افزائی ہوسکے۔

مذکورۂ بالا قسم کے بہت سے کمالات اور صفاتِ عالیہ کے باوجُود کوئی برگزیدہ خاتون نبوّت یا امامت کے منصبِ جلیلہ پر فائز نہیں ہوسکی، جس کی وجہ ظاہری نہیں بلکہ تاویلی ہے اور وہ ذیل کی طرح ہے کہ:۔

(الف) پیغمبر، امام اور معلّم رُوحانی مرد ہیں، اور اُمّت، مرید اور شاگرد رُوحانی عورت، چُنانچہ اگر مردوں کے ہوتے ہوئے کوئی عورت بھی پیغمبر یا امام ہوتی، تو اس کا تاویلی اشارہ (نعوذ باللہ) یہ ہوتا کہ پیغمبر اُمّت کی اطاعت کرے،

امام مرید کا فرمان مانے اور معلم شاگرد سے تعلیم حاصل کرے، تو یہ بات قانونِ قدرت کے خلاف واقع ہوتی، لہٰذا کوئی خاتون پیغمبر یا امام نہیں ہوئی۔ آپ سو سوال حصّہ چہارم میں سوال یا عنوان ۹۷ کو بھی پڑھیں۔

مقامِ معرفت:۔

سوال ۶۹ : ایک شخص مقامِ معرفت میں کب پہنچتا ہے؟ زندگی ہی میں یا مر جانے کے بعد؟

جواب : (الف) انسان کے دُنیا میں آنے کا سب سے بڑا مقصد عبادت اور معرفت ہے تو یہ مقصد اسی دُنیا میں پُورا ہو جانا چاہئے نہ کہ مرنے کے بعد دُوسرے جہان میں، کیونکہ اس میدانِ عمل میں بُنیادی آزمائش یہی ہے کہ انسان کی بندگی اور شناخت کا اندازہ کیا جائے۔

(ب) قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ جو کوئی اس دُنیا میں اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور یہ بہت بڑی گمراہی کا نتیجہ ہوگا (۱۷/۷۲)، یہ اشارہ خُدا شناسی اور رُوح شناسی کی طرف ہے، جس کو معرفت کہتے ہیں، اس سے یہ مطلب صاف ظاہر ہے کہ بُنیادی معرفت دنیاوی زندگی ہی میں ممکن ہے۔

اسماعیلی جماعت:۔

سوال ۷۰ : ہم بوقتِ ضرورت اپنا مذہب دُوسروں کو کس طرح سمجھائیں؟ ہم اپنی جماعت میں غیر اسماعیلیوں کو کیوں نہیں آنے دیتے،

جبکہ دُوسرے لوگ ایسا نہیں کرتے ہیں؟

جواب: ہم زبانی زبانی کتنے لوگوں کو سمجھا سکیں گے اور کس طرح سمجھا دیں گے، جب تک کہ ہمارے پاس اپنے مذہب کی کافی کتابیں موجود نہ ہوں جس طرح کہ دُوسرے لوگوں کی کتابیں ہوتی ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے پاس مختلف موضوعات کی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہو تاکہ رفتہ رفتہ دین کا تعارف ہو، سوالات ختم ہوتے جائیں اور شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جائے، ظاہر ہے کہ کتاب سے جو کام ہوگا وہ زبانی نہ ہو سکے گا۔

اس کے علاوہ کتابوں ہی کی روشنی میں آپ کسی کو اپنے مذہب کا بہتر طریقے سے زبانی تعارف کرا سکتے ہیں اور کتابوں کے بغیر کچھ بھی نہیں۔

دُوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ غیر اسماعیلیوں کو ہمارے خاص مذہبی حلقے میں (ہماری جماعت میں) آنے کی اجازت اس لئے نہیں کہ ہمارا مذہب باطنی، رُوحانی اور تاویلی ہے اس لئے اس کا سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اس مذہب کی تمام تر خُوبیاں بھیدوں میں پوشیدہ ہیں، کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ حقیقت اور معرفت کے اسرار کی تعلیمات ہیں، لہٰذا ہمارے عقائد و رسومات میں شرکت کرنے سے غیر اسماعیلیوں کو کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی اس سے ہمیں کوئی فائدہ ہے۔

اسماعیلیت کے سوا جو بھی مذاہب ہیں وہ باطنی، رُوحانی اور تاویلی نہیں ہیں، وہ تو ظاہری ہیں، اور جو چیز ظاہر ہو وہ سب کی نظر میں ہوتی ہے، لہٰذا اس کی پہچان مشکل نہیں آسان ہے، مگر اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور حکمت سب سے بڑی مشکل ہے۔

اِس سلسلے میں ایک روشن ثبوت یہ ہے کہ خُدا تعالیٰ کی ہستی اور وحدانیّت

کا اقرار لوگوں کے لئے آسان ہے، مگر آنحضرتؐ کی نبوّت و رسالت پر ایمان لانا مقابلۃً مشکل ہے، پھر محمّد رسُول اللہ کی رسالت کو ماننا آسان ہے، مگر علیؑ کی ولایت و امامت کو تسلیم کرنا مشکل ہے، اسی طرح امامت اور اسماعیلی مذہب کے سلسلے میں جُوں جُوں ہم ماضی سے حال کی طرف چلے آتے ہیں تُوں تُوں یہ حقیقی مذہب لوگوں کے لئے مشکل نظر آتا ہے، جس کی مختلف وجوہ ہیں۔

متوفّی کے لئے کپڑے:-

سَوال ۱۷: متوفّی کے حق میں جو کپڑے اور سُفرے پیش کئے جاتے ہیں ان کی کیا تاویل ہوتی ہے؟ کیا ایک رُوحانی (متوفی) اپنے اُن رشتہ داروں سے مُلاقات کر سکتا ہے جو اُس سے پہلے مر چکے تھے؟

جواب: یہ عقیدہ اور رسم ہے اور متوفّی کو ایصالِ ثواب کا ایک طریقہ ہے، مگر اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ اُس رُوحانی (متوفّی) کو کپڑوں اور کھانوں کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ یہ ایک ایسا صدقہ ہے جو دستیاب اور تیار چیزوں سے دیا جاتا ہے، اور مومنِ متوفّی کی رُوح کے حق میں ثواب کے لئے دُعا کی جاتی ہے۔

ہاں، نجات پانے کی صورت میں مومن اپنے عزیز و اقارب سے مل سکتا ہے، خواہ زندے ہوں یا مُردے سب کو دیکھ سکتا ہے، کیونکہ وہاں رُوحانیت ہے اور رُوحانیت میں ہر چیز ممکن ہے کہ سب کی رُوح ہر جگہ حاضر ہے۔

امام کے معنی :-

سوال ۷۲ : امام کے کیا معنی ہوتے، جبکہ ہماری اپنی کتابوں میں اس کا مطلب مذہبی پیشوا ہے؟

جواب : لفظِ امام کے لغوی معنی ہیں سردار، پیشوا یعنی جس کی پیروی کی جائے، نیز امام کے معنی ہیں راستہ، آپ قرآنِ پاک (۱۵/۷۹) میں اِس لفظ کے یہ معنی دیکھ سکتے ہیں، امام راستہ ہے تو کون سا؟ صراطِ مستقیم، جیسا کہ قاضی نعمان "اساس التّاویل" کے صفحہ ۶۱-۶۲ پر فرماتے ہیں :-

والصّراط فی اللّغة الطّریق، فمثّل الامام هٰهُنا بالطّریق لانّ من لزم الطریق لن یّضل، وکذالك من لزم الامام لن یّضل۔ والمراد بالطّریق هٰهُنا الامام لا الطّریق المسلوک فی الارض۔

ترجمہ : اور صراط کے لغوی معنی راستہ کے ہیں، پس یہاں امام کی مثال راستے سے دی گئی ہے کیونکہ جو آدمی راستے سے لازم رہے تو وہ ہرگز گمراہ نہیں ہو جاتا، اور اسی طرح جو شخص امام سے منسلک رہے تو وہ ہرگز گمراہ نہیں ہو جاتا، اور یہاں راستے سے مُراد امام ہے نہ کہ وہ زمینی راستہ جس پر چلا جاتا ہے۔

پیرو مُرشد :-

سوال ۷۳ : کیا کسی ظاہری گُرو (پیرو مُرشد) کی ضرورت ہوتی ہے؟

جواب: آپ نے ایک نامکمل سوال پیش کیا ہے، یعنی اس میں یہ واضح نہیں کہ سوال امام کی اہمیت کے بارے میں ہے یا پیر اور معلّم کی ضرورت کے بارے میں، بہرحال ہم دونوں درجوں کا ذکر کرتے ہیں کہ اگر "گرو" سے آپ کی مراد امام ہے تو جواب ہے کہ امام کا ہونا ہمیشہ اور ہر حال میں انتہائی ضروری ہے، کیونکہ امامِ زمان کے بغیر صراطِ مُستقیم کی ہدایت ناممکن ہے، اور اگر آپ کے نزدیک "گرو" کا مطلب امام کے بعد کا کوئی درجہ ہے تو وہ بھی ضروری ہے۔

اس کتاب میں جگہ جگہ امامِ زمانؑ کی اہمیّت وضرورت کا ذکر آیا ہے، اور اس مبارک و مقدّس ہستی سے دین کو جو رحمتیں اور برکتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں، اس کے بارے میں حقیقی اسماعیلیوں کو کوئی شک و شُبہ نہیں، مگر یہ سوال ضروری ہے کہ موجُودہ زمانے میں امام کے بعد یعنی امام کے تحت معلّموں، استادوں، واعظوں اور عالموں کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور اس مقصد کے حُصول کے لئے دُنیائے اسماعیلیت میں امام کی طرف سے بڑے بڑے ادارے چلتے ہیں یا نہیں؟ تو یقیناً اس کا جواب اثبات میں ملے گا، پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہی جماعتی ادارے اور یہی افراد ہمارے ماضی کے حجتوں، داعیوں اور پیروں کے جانشین ہیں، نام اور ٹائٹل کچھ بھی ہو مگر کام اور علمی خدمت کا فریضہ وہی ہے جو پہلے تھا، ماضی کی طرح اَب بھی علمی اور رُوحانی ترقی کے دروازے کا ملاً کُھلے ہیں۔

اگر آپ حضرتِ مولانا امام سُلطان محمّد شاہ صلوات اللہ علیہ کے اُن تمام مبارک ارشادات کو سامنے رکھیں جو حقیقی مومنین کی علمی اور رُوحانی ترقّی کے بارے میں ہیں تو آپ کو کسی ٹائٹل کے بغیر بھی پیروں کی طرح آگے بڑھنے اور کام کرنے کا بھرپُور جذبہ پیدا ہوگا۔

لفظِ امام کا ہم معنی :-

سوال ۱۴۷ : کیا ویدی فلسفہ میں امام کا کوئی مرادِف (یعنی کوئی ہم معنی لفظ) ہے؟

جواب : جاننا چاہئے کہ الفاظ الگ ہیں اور اصطلاحات الگ، چُنانچہ لفظِ امام کے لغوی معنی کے لئے صرف ویدی فلسفہ میں نہیں بلکہ ہر مذہب اور ہر زبان میں مرادِف الفاظ پائے جاتے ہیں، مگر "امام" کی اصطلاح سوائے دینِ حق کے کہیں بھی نہیں ہے، اس کی وجہ خُدا کے قدیم دین میں نُورِ امامت کی موجودگی ہے کہ جہاں امام تھا وہاں ایک مخصوص اصطلاح بنی ہے، اور دُوسرے لوگ جب تک امامت کا تصوّر اور نظریہ نہ رکھتے تو کیسے یہ اصطلاح ان معنوں کے ساتھ قبول کر سکتے تھے، کیونکہ یہ اصطلاح امام کی ہستی جہاں ہو وہاں ہو سکتی ہے۔

مثال کے طور پر لفظِ رسُول کے لغوی اور اصطلاحی دو معنی ہوتے ہیں چُنانچہ اس کے لغوی معنی ایلچی کے ہیں جو قاصد، پیغام رسان اور سفیر کے لئے مستعمل ہیں، اور رسول کے اصطلاحی معنی اُس انسانِ کامل کے ہیں جو خُدا کی طرف سے بھیجا ہو، یعنی پیغمبر جو کتاب بھی لاتے، اَب رسُول کے جو لفظی معنی ہیں وہ تو ہر قوم اور ہر ملک میں استعمال ہوتے ہیں، مگر رسُول کی جو اصطلاح ہے وہ نہ صرف اُن قوموں میں پائی جاتی ہے، جن کے وہاں کبھی خُدا کی طرف سے کوئی پیغمبر آیا ہو، اس کے برعکس جو لوگ خُدا کی ہستی سے مُنکر ہیں وہ کسی پیغمبر اور دین کے بھی قائل نہیں، لہٰذا ان کے وہاں رسُول کے اصطلاحی معنی موجود نہیں ہیں۔

اسی طرح امام کی اصطلاح تمام معنوں کے ساتھ صرف اُس قوم میں ہے، جس میں واقعاً امام آ رہا ہے، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ویدی فلسفہ میں ایسی کوئی اصطلاح نہیں ہے، مگر ہاں یہ بات ضرور ہے کہ امامِ برحقؑ کی عام باطنی ہدایت کے نظام کے مطابق ہر مذہب میں کوئی پیشوا ہُوا کرتا ہے، جو اُس مذہب کی سطح کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے، کیونکہ دُنیا کے بارہ ۱۲ جزیروں میں امامِ عالی مقام کی جانب سے چوبیس ۲۴ لیلی اور نہاری حجّت مقرّر ہُوا کرتے ہیں۔

غیر اسماعیلی :-

سوال ۷۵ : اگر ایک غیر اسماعیلی رُوحانیت کے سب سے اُونچے درجے کو حاصل کر سکتا ہے تو پھر امام کی ضرورت کیا ہے؟

جواب : آپ نے سوال میں جس امکانیت کا ذکر کیا ہے اس کی مثال یا دلیل پیش نہیں کی ہے، نیز اِس سوال میں یہ منطقی نقص بھی ہے کہ آپ نے صرف ایک غیر اسماعیلی کی طرف اشارہ کیا ہے، اور نجات کے لئے یا رُوحانی بلندی کے لئے صرف ایک ہی شخص کو لیا ہے اور وہ بھی نامعلوم ہی ہے۔

اگر اِس اشارے سے آپ کی مُراد منصُور حلاّج جیسی شخصیت ہے تو اس کے لئے آپ کو تاریخی طور پر صحیح ریسرچ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اسماعیلی تھا، اور اگر اس کو صرف صُوفی مانا جائے تو اُس صُورت میں بھی وہ امام کی عالمگیر ہدایت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ امامِ عالی مقام کی طرف سے اِس دُنیا میں بارہ لیلی حجّت اور بارہ نہاری حجّت مقرّر ہیں، جن کے وسیلے سے امام کی ہدایت اہلِ جہان کو درجہ بدرجہ ملتی رہتی ہے، اور اہلِ تصوّف تو خود اسماعیلیوں

کے قریب ہیں۔

جب ہم مانتے ہیں کہ کارِ ہدایت کے سلسلے میں امامِ برحق خدا اور رسولؐ کا خلیفہ اور نمائندہ ہے، تو یہ بھی ماننا چاہئے کہ جس طرح خدا ربّ العٰلمین اور رسول رحمۃٌ للعٰلمین ہیں اسی طرح امامِ زمان تمام جہان والوں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے، لیکن دُنیا کے مذاہب بھی اور اہلِ مذاہب بھی مختلف درجات پر ہیں، لہٰذا امام کی ہدایت ہر مذہب کو اور ہر شخص کو حسبِ حال ملا کرتی ہے۔

ہر چیز کو بُنیاد سے دیکھنے، سُننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے، چُنانچہ سمجھ لیا جائے کہ خُدا کے بغیر مخلوق نہیں، پیغمبر کے بغیر دین نہیں اور امامِ زمان کے بغیر ہدایت نہیں، اور اگر امامِ زمان کے بغیر ہدایت حاصل ہو سکتی تو رسولؐ کے بعد کسی جانشین کی ضرورت نہ ہوتی، اگر حق بات یہی ہے کہ رسولِ مصطفٰےؐ کا جانشین ضرور ہے تو دیکھنا ہوگا کہ کہاں ہے اور کون ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا برحق جانشین امامِ زمان ہی ہے کیونکہ وہی ہر زمانے میں امامت و خلافت کی تمام خُوبیوں کے ساتھ حاضر اور موجُود ہے۔

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

This Page Intentionally Left Blank

سوسوال (۱۰۰)

حصّہ چہارم

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

This Page Intentionally Left Blank

فہرستِ عنواناتِ "سوسوال" حِصّۂ چہارم

سوال نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
-	سُخنہائے گفتنی	۱۳۷
۷۶	حقیقتِ معراج	۱۴۳
۷۷	الکتاب	۱۴۵
۷۸	سب سے بڑا گناہ	۱۴۶
۷۹	فرشتے	۱۴۸
۸۰	ولایتِ علیؑ	۱۴۹
۸۱	لامکان	۱۵۳
۸۲	اساسؑ اور صامت	۱۵۵
۸۳	حضرتِ عمرانؑ	۱۵۶
۸۴	سلیمان پیغمبرؑ	۱۵۸
۸۵	کُتبِ سماوی	۱۶۰
۸۶	امامؑ کا دیدار	۱۶۴
۸۷	خانۂ کعبہ	۱۶۶
۸۸	یُوسفؑ کا کُرتا	۱۶۷
۸۹	آدابِ دُعا	۱۶۹
۹۰	ہونزائی گنان	۱۷۱

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سوال نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
۹۱	تصوّرِ امامت	۱۷۲
۹۲	چند اشارات	۱۷۵
۹۳	سات آسمان اور سات زمین	۱۷۷
۹۴	علیؑ کا ایمان لانا	۱۷۸
۹۵	میّت پر چھانٹا	۱۸۱
۹۶	اہلِ نجات	۱۸۲
۹۷	عورت اور امامت	۱۸۵
۹۸	امامؑ کی شادی	۱۸۸
۹۹	قربانی	۱۹۰
۱۰۰	امامؑ اور قربانی	۱۹۴

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

سُخنہائے گفتنی

شُکرگزاری :-

پروردگارِ عالمین کی توفیق وعنایت سے "سوسوال" کی کتاب مکمل ہوچکی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کی شکرگزاری کے ساتھ حصّۂ چہارم کی تمہید کے سلسلے میں خامہ فرسائی کرتے ہوئے بیحد مسرّت وشادمانی ہورہی ہے، مگر دِل بول اُٹھتا ہے کہ اے کاش، اس بندۂ خاکسار وناچیز سے خُداوندِ کریم کے ان عظیم احسانات وانعامات کا شکر جیسا کہ چاہیئے ادا ہوسکتا!

رہنمائی اور دستگیری :-

میرے خداوندِ برحق! میرے مالک ومولا! تیرے علم سے حقیقتِ حال ہرگز پوشیدہ نہیں، کہ اگر تیری مُقدّس ہدایت دین شناسی کی اس منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی اور دستگیری نہ کرتی اور تیری رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو مجھ ایسے کمزور اور بیدست وپابندے کہاں اور حصولِ مقصد کہاں، کیونکہ تیرے سہارے کے سوا

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

اس مشکل راستے میں قدم ڈگمگا جاتے ہیں، اور تیری رُوحانی تائید کے بغیر دل و دماغ پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

جذبۂ جُستجو اور شوقِ تحقیق :-

عزیزانِ من! کیا آپ نے کبھی اِس بارے میں غور و خوض کیا ہے؟ کہ فطرتِ انسانی میں ہمیشہ جذبۂ جستجو اور شوقِ تحقیق کیوں پایا جاتا ہے کہ وہ ہر وقت ارض و سما کے عجائب و غرائب کو ایک ایک کر کے پُوری توجہ سے دیکھنا اور جاننا چاہتا ہے؟ انسان کو یہ دعوت کس وجہ سے دی گئی ہے کہ وہ قرآن کے علاوہ آفاق و انفس کی نشانیوں میں بھی خُوب غور و فکر کرے؟ اس کا اصل سبب کیا ہے کہ آدمی کو سیر و تفریح سے دلچسپی اور خُوشی ہوتی ہے؟ اس میں کیا راز پوشیدہ ہے کہ آپ کو مناظرِ قدرت کے مشاہدے سے لطافت و لذّت محسوس ہوتی ہے؟ اس کا رُوحانی پس منظر کیا ہے یا اِس میں حکمت کیا ہے کہ آپ باغ و گلشن کے نظّاروں سے محظوظ و مسرور ہو جاتے ہیں؟ وہ کون سی طاقت ہے جو نہ صرف چھوٹے چھوٹے بچّوں ہی کو بلکہ بڑوں کو بھی پُوچھنے، سوالات کرنے، دریافت کرنے اور جاننے کے لئے آمادہ کر دیتی ہے؟ اور ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھنے سے ایسا کیوں لگتا ہے، جیسے اِنسان ہر بہانے سے اپنی کھوئی ہُوئی دولت کی بازیابی کی تلاش میں لگا ہُوا ہو؟

ان مسائل کا جواب :-

مذکورہ سوالات کا جامع اور واحد جواب یہ ہے کہ اِس نوعیت کی بہت سی اِنسانی صلاحیتوں، قوتوں اور اُمنگوں کے پسِ پردہ قدرتِ خداوندی خود ہی موجود اور کارفرما ہے اور وہی انسان کو ہر وقت اِس بات کی ترغیب دیتی رہتی ہے کہ وہ اشیائے کائنات اور مظاہرِ قدرت کی باطنی حقیقتوں کو اور ان میں سے ذاتِ سُبحان کے چُھپے ہوئے بھیدوں کو پائے، تاکہ ان تمام اسرارِ باطن کے وسیلے سے ربّ العزت کی معرفت حاصل ہو، کیونکہ معرفت میں دائمی زندگی اور ابدی نجات ہے، اور اسی میں عالمِ لامکان کی لازوال سلطنت ہے، اور لامکان وہ ہے جس میں ماضی و مستقبل کے بغیر ازلی وابدی نعمتیں ہمیشہ حاضر اور موجُود رہتی ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ ہادیٔ برحق علیہ السّلام کی نُورانی ہدایت کے بغیر اِن اسرارِ عظیم کو کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔

وسیلۂ ہدایت :-

اِن معنوں کی وضاحت یہ ہے کہ عقل و دانش اور علم و حکمت کی لازوال دولت سے صرف ایسے ہی لوگ مالامال ہو سکتے ہیں، جو اسرارِ فطرت اور رموزِ خلقت کو سمجھنے کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، اور وہ وسیلہ جانشینِ رسُولِ اکرمؐ ہے جو ظاہری و باطنی ہدایت کا سرچشمہ ہے، اسی رہنمائے راہِ راست کی پیروی میں حیات و کائنات کے بھید اور کتابِ سماوی کے اسرار منکشف ہو جاتے

ہیں، اور انہی رازوں میں خودی اور خدائی کی معرفت و شناخت کے انمول خزانے چھپائے ہوئے ہیں، تاکہ خاصانِ خدا ان مخفی ترین خزانوں کو حاصل کرکے اپنی "انائے علوی" کی ازلی و ابدی حقیقت کو پہچان لیں، وہ حقیقت ایسی انوکھی اور نرالی شان والی ہے جو کبھی حقیقتِ حقائق سے الگ نہیں ہوئی اور نہ کسی وقت جدا ہو سکتی ہے۔

خود شناسی اور خدا شناسی :-

ہاں یہ حق بات ہے کہ خود شناسی اور خدا شناسی کا علم خاص ترین ہے، جو کتابِ سماوی اور کتابِ کائنات کے اسرار یعنی بھیدوں میں پوشیدہ ہے، ان کتابوں میں ایک مجمل ہے اور دوسری مفصّل، اور ایک تیسری کتاب بھی ہے جو زندہ اور بولتی ہے، یہ کتابِ ذات یا کتابِ نفس ہے، اس کو کتابِ رُوح بھی کہتے ہیں، اور اسی کی شان میں فرمایا گیا ہے کہ: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹۱:۹) (جس نے جان کو پاک رکھا وہ تو کامیاب ہوا) نفس اور رُوح کی طہارت و پاکیزگی اس لئے ضروری ہے، کہ یہ اپنی اصلی حالت میں ایک معجزاتی آئینہ ہے، جسے آئینۂ حقائق نما کہنا چاہیئے، کیونکہ اسی میں آیاتِ رحمان اپنی پوری چمک دمک اور اصل تجلیوں کے ساتھ منعکس ہو جاتی ہیں، خواہ وہ آیتیں قرآن کی ہوں یا عالمِ جسمانی کی۔

اعزّہ کے لئے شکریہ :-

مَیں آخر میں اپنے "خانۂ حکمت" کے محسن اور معزز عملداران و ارکان کا انتہائی

قدر دانی کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ ان حضرات نے اس ادارے کے علمی مقصد کو آگے بڑھانے اور پیاری جماعت کی ایک مستقل خدمت انجام دینے کی خاطر طرح طرح کی تکالیف اور زحمتیں برداشت کی ہیں، اور اپنی عمرِ گرانمایہ کے بہت سے اوقات کو جو زندگی کے اجزاء ہیں علمی خدمت کے لئے بصد شوق قربان کر دیا ہے، یہ میرے وہ عزیزان ہیں جو ایک منظّم ادارے کی شکل میں شب و روز سخت محنت اور جانفشانی سے کام کرتے ہیں، ان رُوحانی احباب کے علاوہ کراچی، راولپنڈی، چترال، گلگت اور ہونزہ میں بھی بہت سے اَعزّہ ایسے ہیں، جن کو نہ صرف حصولِ علم ہی کا زبردست شوق ہے، بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ علمی خدمت سے بھی دلچسپی لیتے ہیں۔

جانِ عزیز جناب ڈاکٹر فقیر محمّد صاحب ہونزائی کے جواہرات جیسے قیمتی مشوروں، موتیوں کی بارش جیسی مہربانیوں اور پہاڑ جیسی پُشت پناہی کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے، بجھے ایسے شایانِ شان الفاظ نہیں ملتے کہ جن کے استعمال کرنے سے موصُوف کے عظیم احسانات کا حق شکر گزاری ادا ہو سکے۔

مَیں انتہائی اخلاص و محبّت کے الفاظ میں اور قدر دانی و احسان شناسی کے انداز میں اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے کینیڈا کی نیکنام "ایسٹرن کینیڈا ریجنل کمیٹی" اور وہاں کی پیاری جماعت کا شکریہ ادا کرتا ہُوں، کہ اُنہوں نے ہمیں علمی خدمت کا ایک نایاب زرّین موقع عنایت کیا، اس سلسلے میں ان چند فرشتہ صفت خاندانوں کی پُرخلوص مہمان نوازی اور بیمثال خدمات کی شکر گزاری بڑی خصوصیت کے ساتھ ہم پر واجب ہو جاتی ہے، جن کے بابرکت گھروں میں ہمارے لئے نہ صرف آرامگاہ کا اعلیٰ انتظام تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک

صاف سُتھرا دفتر اور ایک میٹنگ رُوم بھی مخصوص کیا جاتا تھا، تاکہ ہم خود کو اچھی طرح سے تیار کر کے گرد و نواح کے علاقوں کی جماعتوں میں دَورہ کر سکیں اور دُوسرے اوقات میں گھر بیٹھ کر خواہشمند افراد سے مذہبی گفتگو کریں، ہم اِن شاء اللہ ان عزیزوں کے ممنُون، احسان مند، شکر گزار اور دُعاگو رہیں گے، اور ان کی اخلاقی بلندیوں، مذہبی خُوبیوں اور ملکوتی صفات کو ہرگز فراموش نہ کریں گے۔

اَب میں اُس قلمی اور علمی تعاون کی طرف اشارہ کروں گا جو وہاں پر انگلش اور فرنچ میں میری کچھ کتابوں کو منتقل کرنے اور ٹائپنگ کا کام کرنے کی صُورت میں ہمیں حاصل ہے، اِس مناسبت سے میں نیک خیالات، رُوحانی تصوّرات اور عجز و انکساری کی دُعاؤں میں روئے زمین کے اُن فرشتوں کو بار بار یاد کرتا ہُوں، کہ جن کی قلمی معاونت اِس درویش کی ہمّت افزائی کا باعث ہے۔

پس یہ میری انتہائی عاجزانہ دُعا ہے کہ اے ربِّ عزت! ان تمام حقیقی دینداروں کو تیرے پسندیدہ اور برگزیدہ بندوں کی با اثر دُعائیں حاصل ہوں! خُداوندا! انہیں دونوں جہان کی سعادت و سلامتی اور کامیابی عطا فرما! ان کو زندگی اور عمر کی گرانمایہ دولت صرف کر کے زیادہ سے زیادہ علمی اور دینی خدمات انجام دینے کا حوصلہ عنایت کرنا! اور ان کی تمام نیک مُرادیں پوری کر دیں! آمین یاربّ العلمین!!

بندۂ عاجز

نصیر ہونزائی

سنیچر ۲۱، رمضان ۱۳۹۸ھ

۲۶، اگست ۱۹۷۸ء سالِ اسپ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حقیقتِ معراج :۔

سَوال ۷۶ : حضورِ اکرمؐ کی معراج جسمانی طور پر ہُوئی تھی یا رُوحانی کیفیت میں؟ نیز آپ یہ بتائیں کہ آنحضرتؐ کو مسجدِ اقصیٰ کی طرف لیجانا کیوں ضروری ہُوا؟ خُدا تعالیٰ کی طرف سے رسُولِ برحقؐ کو جن معجزات کا دکھانا منظور تھا وہ مسجدِ حرام (خانۂ کعبہ) میں کیوں نہیں دکھائے گئے کہ مسجدِ اقصیٰ میں دکھاتے گئے؟

جَواب : (الف) معراج کشفِ باطن اور رُوحانیت کے عُروج کا نام ہے، جو ذکر و عبادت کا نتیجہ ہے، قربِ خُداوندی باطنی اور رُوحانی طریق پر ہے نہ جسمانی طور پر، عالمِ عُلوی سے دُنیائے رُوحانیت مُراد ہے، جو لامکانی حیثیت میں پائی جاتی ہے۔

(ب) جب اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں سموتا نہیں صرف بندۂ مومن کے دل میں سموتا ہے تو پھر اِس قلبی عرش کی ترجیح کے بعد دُوسرے کسی عرش کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا، اور وہ تمام قرآنی آیات تاویلی قرار پاتی ہیں، جن میں عرش پر اللہ پاک کے "استویٰ" کا ذکر ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ روشنی میں آنحضرتؐ نے دل کے عرش کے معجزات و عجائبات کا مشاہدہ کیا تھا اور معراج اسی صورت میں پیش آئی تھی۔

(ج) آپ کا دوسرا سوال اُس ارشاد سے متعلق ہے جو سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کے شروع میں ہے، جس میں حضورِ انورؐ کو معراج کے سلسلے میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصٰے کی طرف لے جانے کا ذکر ہے، سو جاننے کی ضرورت ہے کہ قرآن کی رُو سے مسجد کے دو معنی ہیں، پہلے معنی ہیں سجدہ کرنے کی جگہ، جس کا مطلب مسجد اور عبادت خانہ ہی ہے، اور دُوسرے معنی ہیں ذکر و عبادت، جیسے یہ لفظ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۳۱ کے ارشاد میں آیا ہے، چنانچہ مسجدِ حرام سے وہ حُرمت والا اسمِ اعظم مُراد ہے، جو آنحضرتؐ کو شروع شروع میں دیا گیا تھا، اور مسجدِ اقصٰی کا مطلب ہے وہ رُوحانیت کی بلندی اور دُور کی ترقی کا معجزانہ اسمِ اعظم جو حضور کو بعد میں یعنی رُوحانی معراج کے وقت بتایا گیا، اسی معنیٰ میں یہ ذکرِ الٰہی مسجدِ اقصٰی کہلایا، جس میں رُوحانیت و نُورانیت کے بھرپُور معجزات پوشیدہ تھے۔

(د) اسمِ اعظم کے تاویلی پس منظر میں نبوّت و امامت کے مراتب پوشیدہ ہوتے ہیں، چنانچہ معنویت کی گہرائی میں اسماعیلیت کی مختلف تاویلات آپس میں مل جاتی ہیں، اور دانشمند کے نزدیک ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہوتا، میرا مقصد ہے کہ "وجہِ دین" میں مسجدِ حرام کی جو تاویل بتائی گئی ہے اس سے یہ تاویل اساسی طور پر مختلف نہیں ہے۔

نوٹ: معراج کے بارے میں مزید معلومات کے لئے میرے ایک مقالہ "معراجِ رُوح" کا مطالعہ مُفید ہوگا، جس کا انگلش میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے، یہ ترجمہ جانِ عزیز ڈاکٹر فقیر محمّد صاحب ہونزائی کا ہے۔

الکتاب :-

سوال ۷۷ : یہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، لیکن اس بات کی وضاحت چاہیئے کہ دین بھی ایک ہے، اور خُدا کی کتاب بھی ایک ہے۔

جوابؔ : (الف) جب آپ نے اِس حقیقت کو یقین مانا کہ خُدا ایک ہے، تو یہ امر بھی یقینی ہے کہ اللہ کا دین اور اس کی کتاب ایک ہے، کیونکہ خُداوند تعالیٰ کی عادت و سُنّت اور قانون ایک ہی ہے اور دین قانونِ الٰہی کا دوسرا نام ہے، یہی حقیقت آسمانی کتاب کی بھی ہے کہ وہ دینِ حق کی رُوحانی اور تحریری صُورت ہے اس لئے وہ دینِ واحد سے الگ نہیں۔

(ب) قرآنی ارشادات میں جگہ جگہ اِس حقیقت کا ذکر ہے کہ آسمانی کتاب اصل میں ایک ہے، دینِ فطرت یعنی اسلام شروع سے لے کر آخر تک ایک ہے، اور انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام بھی نفسِ واحدہ کی طرح ایک ہیں۔

(ج) قرآنِ حکیم میں فرمایا گیا ہے کہ: (پہلے) سب لوگ ایک ہی اُمت تھے پھر خُدا نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبروں کو بھیجا اور ان کے ساتھ برحق کتاب بھی نازل کی تاکہ جن باتوں میں لوگ جھگڑتے تھے (کتابِ خُدا) اس کا، فیصلہ کر دے (۲/۲۱۳)۔

اِس آیۂ مُقدّسہ کی روشنی میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بظاہر آسمانی کتابیں بہت سی ہیں، لیکن اصل میں ایک ہی کتاب ہے جس کی یہ مختلف زبانوں میں جُدا جُدا شکلیں ہیں، اور تنزیل و تاویل کے اعتبار سے یہ واحد کتاب تمام انبیاء و ائمّہ میں مُشترک ہے، مطلب صاف روشن ہے کہ جب خُدا کی کتاب

حقیقت میں ایک ہے اور انبیا و ائمۃ علیہم السّلام کا مقصد ایک ہے تو دینِ حق بھی شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی ہے۔

سب سے بڑا گناہ :-

سوال ۸۲ : سب سے بڑا گناہ کون سا ہے جو معاف نہ ہو سکے؟ تفصیل سے بتا دیں۔

جواب : سب سے بڑا گناہ شرک ہے جو معاف نہیں ہو سکتا ہے جیسا کہ اللہ کا فرمانِ اقدس ہے کہ "خدا بے شک اس کو نہیں بخشتا کہ اس کا کوئی اور شریک بنایا جائے، ہاں اس کے سوا جو گناہ ہو جس کو چاہے بخش دے، اور (معاذ اللہ) جس نے کسی کو خدا کا شریک بنایا وہ تو بس بھٹک کے بہت دور جا پڑا (۱۱۶/۴)"

خوب جان لو کہ جس طرح شرک سب سے عظیم گناہ ہے اسی طرح اس سے بچ کر خدا کی شناخت اور توحید کا راستہ اختیار کرنا بہت بڑا ثواب ہے، چنانچہ اگر یہ دونوں باتیں عام اور قابلِ فہم ہوتیں جیسے عوام کا خیال ہے اور شرک و توحید کے کچھ بھید نہ ہوتے تو سب کے سب بڑی آسانی سے نجات پا سکتے اور کوئی گمراہ نہ ہو جاتا، ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اِن دونوں باتوں میں کچھ راز ہیں۔

اس آیۂ کریمہ میں تحقیق کرنے سے پتا چلتا ہے کہ شرک کا نتیجہ بہت دور کی گمراہی کی صورت میں نکلتا ہے، اور اس نسبت سے صراطِ مستقیم اور ہادیٔ برحق کا تصوّر سامنے آتا ہے، کیونکہ گمراہی کسی شخص کی اُس حالت و کیفیت کا نام ہے جو راہِ راست اور ہادیٔ زمان سے دور ہو جانے سے اُس پر گزرتی ہے

اس سے ایک طرف تو یہ معلوم ہُوا کہ شرک اور گمراہی کا ایک مطلب ہے اور دُوسری طرف یہ کہ توحید اور ہدایت راہِ حق اور رہنمائے وقت سے جُدا نہیں۔

اَب دیکھنا ہوگا کہ دین میں خُدا کی معرفت یعنی پہچان مسلّمہ ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ کوئی مُسلمان اِس امر سے انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ اسلام صراطِ مستقیم ہے یعنی دین خُدا کے حضور جانے کا راستہ ہے اور اِس راستے کی منزلیں چار ہیں جو شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت ہیں، ان منازل میں آخری منزل معرفت اِس معنی میں ہے کہ راہِ دین کی ساری مسافتیں طے کر چُکنے کے بعد ہی خُدا کی شناخت حاصل ہو جاتی ہے اور جب خُدا کو اسی طرح پہچانا جاتا ہے تو شرک جو سب سے بڑا گُناہ اور سب سے دُور کی گمراہی ہے، اُس سے نجات ملتی ہے ورنہ نہیں، یہی وجہ ہے جو مَیں نے شروع میں کہا تھا کہ یہ دونوں باتیں یعنی شرک اور توحید ایسی نہیں ہیں جیسا کہ اُن کے بارے میں عوام کا خیال ہے۔

جب خُدا اور رسُولؐ کے مقرّر کردہ ہادی کی ہدایت کی روشنی میں حصولِ معرفت برحق ہے اور اللہ تعالیٰ کی حقیقی توحید معرفت کے بعد ہے تو مومنین پر واجب ہے کہ وہ ہمیشہ خُدا شناسی کے علم کے لئے کوشاں رہیں۔

اِس کے علاوہ شرک کے بارے میں حکیمِ نامور حضرتِ پیر ناصرِ خسروؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "وجہِ دین" کے کلام ۴۳ میں دیکھیں، آپ کے ارشادِ گرامی کا خلاصہ یہ ہے کہ امامِ برحق علیہ السّلام کی جگہ کسی اور کو امام تسلیم کرنا تاویل میں شرک کہلاتا ہے، ورنہ خدا کو خُدا تسلیم کر لینے کے بعد کوئی شخص شرک کا تصوّر نہیں کر سکتا ہے۔

فرشتے :-

سوال ۷۹ : فرشتہ کس قسم کی مخلوق کا نام ہے؟ اور اس کی خاصیت کیا ہے؟

جواب : (الف) فرشتہ رُوحانی اور نُورانی مخلوق کا نام ہے، وہ کامل انسانوں اور حقیقی مومنوں کی پاکیزہ رُوحوں کی حیثیت سے ہُوا کرتے ہیں، اِس نسبت سے بعض دفعہ قرآنِ حکیم نے اعلیٰ درجے کے جسمانیوں کو بھی فرشتہ قرار دیا ہے، آپ قرآن پاک کی (۶/۹، ۱۷/۹۵، ۴۳/۶۰) کے ارشادات کو خُوب غور سے دیکھیں۔

(ب) فرشتوں کی بُنیادی خصوصیات یہ ہیں کہ: وہ عبادت میں بڑائی نہیں کرتے ہیں، یعنی ان میں بدرجۂ انتہا عجز و انکساری کی کیفیّت موجود ہوتی ہے وہ ذکر و عبادت سے تھکتے نہیں، شب و روز اللہ تعالےٰ کی تسبیح کرلیا کرتے ہیں اور کاہلی نہیں کرتے، یہ صفات رُوحانی فرشتوں کے علاوہ جسمانی فرشتوں میں بھی ممکن ہے (۲۰/۱۹-۲۰) مزید برآں فرشتوں کی ایک خاصیّت فرمانبرداری اور خوفِ خُدا ہے (۱۶/۵۰)۔

(ج) عظیم فرشتوں کا ایک خاص وصف علم و معرفت ہے، اور ان کو اسی وجہ سے حاملانِ عرش ہونے کا درجہ حاصل ہے کیونکہ ربّ العزّت کا عرشِ عظیم عقل و دانش اور علم و معرفت ہی کا ہے، چُنانچہ جو فرشتے عرش کو اُٹھاتے ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:-

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (۴۰/۷)

اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز پر احاطہ کئے ہُوئے ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ حاملانِ عرش نورِ علم و معرفت کی روشنی میں ذاتی طور پر اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ظاہر و باطن کی ہر چیز رحمت اور علم کے گھیرے سے باہر نہیں ہے، اس سے ان عظیم فرشتوں کی علمی برتری و بزرگی ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ دونوں جہان کی تمام چیزوں کو بیک نظر دیکھتے ہیں۔

(د) یہ حقیقت ہے کہ حاملانِ عرش سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور آپ کے بعد آپ کے اوصیا یعنی ائمّۂ اطہار علیہم السّلام ہیں، آپ اگر چاہیں تو اس مطلب کی مزید تحقیق کے لئے قرآن کے شیعی ترجموں، حاشیوں اور تفسیروں میں موضوعِ "عرش" کو دیکھ سکتے ہیں۔

ولایتِ علیؑ:-

سوال ۸۰: حضرتِ علیؑ کی ولایت مومن کے لئے کیونکر ضروری ہو سکتی ہے؟ کیا قرآن و حدیث سے اس کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے؟

جواب: (الف) حضرتِ مولانا علی علیہ السّلام کی ولایت و دوستی کی اہمیت و ضرورت اس لئے ہے کہ آپ کی ولایت خُدا اور رسُولؐ کی ولایت ہے، چونکہ آپؑ بحکمِ خُدا پیغمبر اکرمؐ کے بعد ولیِّ امر ہیں۔

(ب) حضرتِ مرتضےٰ علیؑ رسُول اللہ کے حقیقی جانشین اور امامِ برحق ہیں، لہٰذا ان کی ولایت، محبّت، دوستی اور اطاعت فرض ہے۔

(ج) قرآنِ حکیم کا ارشادِ مُقدّس ہے کہ: (اے رسُولؐ ان لوگوں سے) کہدو کہ اگر تُم خُدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو (خُدا بھی) تم کو دوست رکھے

گا (۳۱/۳)، چُنانچہ اِس فرمانِ خداوندی کے مطابق جب اللہ تعالیٰ کی اِطاعت ومحبت بِلاواسطہ نہیں بالواسطہ ہے یعنی آنحضرتؐ کے ذریعے سے ممکن ہے تو پھر اس میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ بالکل اسی طرح پیغمبرِ خُدا کی اطاعت ومحبت علیؑ کے وسیلے سے میّسر ہوتی ہے۔

(د) اللہ تعالیٰ کا پاک فرمان ہے کہ:-

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ (۵/۵۵)

(اے ایماندارو) تمہارے مالک سرپرست بس یہی ہیں خُدا اور اس کا رسُولؐ اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اِس آیۂ کریمہ میں ولایت کے تینوں درجات کا ذکر ایک ساتھ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ وہ درجے اصل میں ایک ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی ولایت پیغمبرؐ کے ذریعے سے ہے اور آنحضرتؐ کی ولایت علیؑ کے وسیلے سے، جس طرح اطاعت تین درجوں میں ہے: اللہ کی اطاعت، رسُولؐ کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت (۴/۵۹) مگر یہ اطاعتیں حقیقت میں ایک ہیں۔

(ہ) یہ معتبر روایت مشہور ہے کہ مذکورۂ بالا آیت مولا علیؑ کی شان میں نازل ہُوئی ہے، کیونکہ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ صرف امیرالمومنینؑ ہی نے ایک سائل کو دی تھی، آپ متعلقہ کتب میں دیکھیں، اب رہا کسی شخص کا یہ سوال کہ اگر مذکورہ آیہ حضرتِ علیؑ کی شان میں ہے تو خُدا اور رسُولؐ کے بعد جن کی ولایت کا ذکر ہوا ہے وہ صیغۂ جمع میں کیوں ہیں؟ یعنی اگر یہ اوصاف علیؑ کے ہیں تو پھر کیوں یہ واحد کے طور پر بیان نہیں ہُوتے؟

اِس کا پہلا جواب یُوں ہے کہ اِس آیۂ مُقدسہ میں جن لوگوں کو ولایت کی تعلیم دی گئی ہے وہ تو تمام مُسلمین و مومنین ہیں، اور خُدا اور رسُولؐ کے بعد جن حضرات کی ولایت فرض کی گئی ہے، وہ سارے مُسلمانوں اور مومنوں سے مخصوص وممتاز ہو کر الگ ہیں، چُنانچہ اِس قرآنی تعلیم سے ایک طرف تو یہ معلوم ہُوا کہ یہاں اُس عام قسم کی محبت و دوستی کا ذکر نہیں جو ایک مُسلم کو دُوسرے مُسلم سے ہونی چاہیئے، اور دُوسری طرف یہ پتا چلا کہ ایمان کے درجۂ کمال پر کچھ برگزیدہ افراد ہیں جن کی ولایت تمام اہلِ اسلام پر فرض ہے۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ نماز کے دوران رکوع کی حالت میں اصحابِ کبار رضوان اللہ علیہم میں سے کسی فرد نے سائل کو زکوٰۃ نہیں دی ہے، مگر حضرتِ علی علیہ السّلام نے، اور یہ ایک پُرحکمت اتّفاق ہے، چُنانچہ ثابت ہے کہ یہ آیت علیؑ ہی کی شان میں ہے اور پیغمبرِ اکرمؐ کے بعد علیؑ کی ولایت مُسلّمہ ہے، اور علیؑ کے ولیِّ امر ہونے کے ثبوت میں یہی ایک نہیں بلکہ بہت سی آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی وارد ہُوئی ہیں، لہٰذا یہاں سوال اِس طرح ہونا چاہیئے کہ اِس آیۂ مُقدسہ میں علیِ مرتضیٰؑ کا ذکرِ جمیل بہت سے افراد کی طرح کرنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ اور یہ فردِ واحد کی طرح کیوں نہیں؟ تاکہ اس کا جواب ذیل کی طرح دیا جائے:۔

ا۔ یہی تو قرآنی حکمت کا ایک خاص اعجاز ہے کہ صحیح مقام پر ایک فرد کے بیان میں بہت سے افراد کا ذکر کیا گیا ہے، چُنانچہ اللہ تعالےٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے حضرتِ علی صلوات اللہ علیہ کے فعل کو آپؑ کی نسل کے تمام ائمۂ برحق علیہم السّلام کا فعل قرار دیا ہے، تاکہ اہلِ دانش پر یہ حقیقت ظاہر ہو کہ پاک ائمّہؑ سب کے سب نہ صرف مرتبۂ ولایت پر نفسِ واحدہ کی طرح متحد ہیں

بلکہ وہ حضرات کارِ ہدایت کے اعتبار سے بھی ہمیشہ ایک ہیں، سو یہی وجہ ہے کہ آیۂ مذکورہ میں امیر المومنین علی علیہ السّلام کے اوصاف جمع کے صیغے میں بیان ہُوئے ہیں۔

۲۔ ارشاد ہُوا ہے کہ:۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۶/۱۲۰)۔

اس میں شک ہی نہیں کہ ابراہیم خُدا کی ایک فرمانبردار جماعت (یعنی ایک مطیع قوم کی حیثیت سے)، تھا جو باطل سے کترا کر چلتا تھا اور مشرکین سے (ہرگز)، نہ تھا۔ سو یہاں پر بھی وہی حقیقت ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کا فعل آلِ ابراہیم کے تمام انبیاء و ائمہ کا فعل تھا، کیونکہ آپؑ اِن سب کے مورثِ اعلیٰ تھے، اور آپ کا مرتبہ انہی پیغمبروں اور اماموں کے سلسلے میں تا قیامت قائم رہنے والا تھا، جیسا کہ قرآن پاک کی (۴/۵۴) کے ارشاد سے ظاہر ہے۔

۳۔ اِس سلسلے میں ایک عام مثال بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآنِ حکیم ماضی اور حال کے کافروں کو کس طرح ایک قرار دیتا ہے جبکہ ان کے کفر و عصیان کا طریقہ ایک ہی ہے، چُنانچہ فرمایا گیا ہے کہ: (اے رسُولؐ)، اُن سے یہ تو پُوچھو کہ تُم اگر ایماندار ہو تو پھر کیوں ماضی میں خُدا کے پیغمبروں کو قتل کرتے تھے (۲/۹۱)،

ظاہر بات ہے کہ اِس آیۂ کریمہ کے مطابق جن لوگوں نے ماضی میں خُدا کے بعض پیغمبروں کو قتل کیا تھا وہ تو رسُول اللہؐ کے زمانے میں خود موجود نہیں، کیونکہ وہ بہت پہلے اس دُنیا سے چل بسے تھے، مگر اُن کے ہم خیال اور نظریاتی جانشین یعنی بالکل اُن جیسے کافر موجود تھے، لہٰذا تمام اگلے اور پچھلے کافروں کو ایک قرار دیتے ہُوئے فرمایا گیا کہ تُم نے انبیاء کو کیوں قتل کیا۔

(د) علی و آئمۂ اولادِ علی صلوات اللہ علیہم اجمعین کی ولایت کے بارے میں ان قرآنی دلائل کے بعد ارشاداتِ نبوی کی طرف توجّہ دلائی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں آنحضرتؐ کے بہت سے فرمودات ہیں جن سے ان حضرات کی ولایت ثابت ہے، لیکن ہمیں یہاں سوسوالات کے سلسلے میں کسی بھی جواب کو حد سے زیادہ طول نہیں دینا ہے، لہٰذا یہاں صرف ایک ہی بڑی اہمیت والی حدیث پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا:

میں علیؑ سے ہُوں

اور

علیؑ مجھ سے ہیں۔

اگر عقل و دانش کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ اِس ارشادِ نبوی میں بہت بڑی معنوی جامعیت موجُود ہے، اور وہ اس طرح کہ آنحضرتؐ سے علیؑ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ عقل و دانش، علم و حکمت اور رُشد و ہدایت کے تمام خزانے علیؑ کو نبیؐ سے حاصل تھے، اور پھر علیؑ سے آنحضورؐ کے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ حضرتؐ کا مُقدّس نور مولا علیؑ میں منتقل ہوا اور آلِ مُحمّدؐ و اولادِ علیؑ کے سلسلۂ امامت میں یہ نور ہمیشہ کے لئے زندہ اور تابندہ ہے۔

لامکان:۔

سوال ۸۱: لامکان کہاں ہے؟ وہ کیا چیز ہے؟ اس کی کیفیّت وحقیقت کیا ہے؟ تفصیل سے بتا دیں۔

جواب : تمہارے سوال کا پہلا جملہ غلط ہے، جس میں تُم نے پُوچھا ہے کہ لامکان کہاں ہے، جبکہ لامکان (مکان نہیں)، ایک غیر مکانی کیفیت ہے، وہ لامکان اِس لئے ہے کہ مکان کی صفات کے برعکس ہے، باقی سوال ٹھیک ہے۔

جس طرح مادّہ اور جسم مکان میں ہے بلکہ یہ چیز خود مکان ہے اِسی طرح غیر مادّہ یعنی رُوح اور اس کا تصوّر لامکان ہے، چُنانچہ عالمِ رُوحانی لامکان ہے، جس کا مشاہدہ نہ صرف مرنے کے بعد ہو سکتا ہے بلکہ زندگی میں بھی ممکن ہے۔

جیسے جسم سے مکان الگ نہیں ہو سکتا ہے بلکہ جسم اور مکان ایک ہی چیز ہے اسی طرح زمان بھی جسم کی گردش سے پیدا ہوتا ہے، چُنانچہ اگر یہ کائنات نہ ہو تو اُس صورت میں نہ صرف جسم نہ رہے گا بلکہ مکان و زمان بھی ختم ہو جائے گا، اس سے ظاہر ہے کہ مکان اور زمان کا تعلّق جسم سے ہے، اور رُوح جس طرح لامکان ہے اسی طرح لازمان بھی ہے۔

دانش مند کو لامکان کی حقیقت سمجھنے کے لئے ایک عام مثال عالمِ خواب ہے، کیونکہ اِنسان جب خواب دیکھتا ہے تو وہ اِس کے لئے کہیں بھی نہیں جاتا مگر لامکانی کیفیت میں ہوتا ہے، یعنی وہ اپنی رُوح کی طرف متوجہ ہوتا ہے جبکہ رُوح خود عالمِ لامکان ہے تو اس وقت اِس لامکان کی تمام چیزیں مادّیت کے بغیر پائی جاتی ہیں، اس سے معلوم ہُوا کہ عالمِ رُوحانی اور اصل لامکان میں مادّی چیزیں اِس طرح نہیں ہوتی ہیں جس طرح وہ اِس دُنیا میں ہیں، مگر ہاں ان کا جوہر یعنی ان کی رُوحانی شکلیں موجُود ہوتی ہیں، جس طرح خواب میں ہر چیز جسم کو چھوڑ کر اپنی رُوحانی صُورت میں حاضر ہوتی ہے۔

اصل لامکان سے عالمگیر رُوح مُراد ہے جس کو نفسِ کُلّی کہا جاتا ہے وہی

عالمِ رُوحانی اور آخرت ہے، اسی میں سب رُوحانی قسم کی چیزیں موجُود ہیں، جنّت بھی اسی میں ہے، وہ جہان زندہ اور دانا ہے۔

ہم نے کہا تھا کہ جس طرح رُوح لامکان ہے اسی طرح وہ لازمان بھی ہے، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ عالمِ رُوحانی کی ہر چیز زمانے کی قید سے بالاتر ہے کہ وہاں نہ کوئی ماضی ہے اور نہ کوئی مُستقبل، وقت کی جو کچھ کیفیّت ہے وہ حال کی طرح ہے، اِس لئے کہنا چاہیئے کہ وہاں زمانِ ناگُذر زندہ ہے جسے دہر کہا جاتا ہے۔

اساسؑ اور صامت:-

سَوال ۸۲ : اساسؑ اور صامت کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ اور وہ کتنے ہُوئے ہیں؟ وضاحت سے بتا دیں۔

جَواب : اساس کے لفظی معنی "بنیاد" کے ہیں اور اسماعیلی اصطلاح میں اساسؑ اُس امام کو کہتے ہیں جو کسی رسُولِ ناطق کا وصی اور جانشین ہُوا کرتا ہے، اور وہیں سے امامت کے ایک دَور کا آغاز ہوتا ہے، اور صامت بھی اسی اساس کو اس نسبت سے کہتے ہیں کہ وہ رسُولِ ناطق (یعنی آسمانی کتاب اور شریعت کی ترجمانی کرنے والا پیغمبر) کی موجودگی میں خاموش رہتا ہے، مگر یہی اساس بعد میں کتابِ صامت کی نسبت سے کتابِ ناطق کہلاتا ہے۔

حضرتِ آدمؑ کا پہلا اساس مولانا ہابیلؑ تھا، جب اُس کو قابیل نے شہید کر دیا، تو مولانا شیثؑ اساس مقرّر ہُوا، حضرتِ نوحؑ کا اساس مولانا سامؑ، حضرتِ ابراہیمؑ کا مولانا اسماعیلؑ، حضرتِ مُوسیٰؑ کا پہلے مولانا ہارونؑ اور ان کے وفات کے بعد مولانا یوشعؑ بن نون اساس ہُوا، حضرتِ عیسےٰؑ کا اساس شمعونؑ تھا

اور حضرتِ محمدؐ کا مولانا علی مرتضیٰؑ۔ ان چھ ناطقوں کے یہ چھ اساس ہوئے۔

حضرتِ عمرانؑ:-

سوال ۸۳ء: آپ وضاحت کر کے بتائیں کہ وہ عمران کونسا ہے جس کی آل کی برگزیدگی کا قرآنِ مقدس میں ذکر کیا گیا ہے، جبکہ عمران ایک سے زیادہ ہیں؟

جواب: آپ کا سوال آیۂ اصطفا سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ: بے شک خدا نے آدمؑ اور نوحؑ اور خاندانِ ابراہیمؑ اور خاندانِ عمرانؑ کو سارے جہان سے برگزیدہ کیا ہے (۳/۳۳)۔

آپ کا یہ سوال درست اور بجا ہے، کیونکہ اس عمران کے تعین کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، جبکہ عمران اس سلسلے میں کئی ہیں، جیسے (۱) عمران جو حضرتِ موسیٰؑ کے والد تھے (۲) عمران بن ماثان جو دورِ موسیٰؑ کے چھٹے امامؑ تھے (۳) عمران (بی بی مریمؑ کے باپ) (۴) عمران (ہاشم بن عبدمناف) اور (۵) عمران حضرتِ ابوطالب علیہ السّلام۔

چونکہ اس آیۂ کریمہ میں انبیائے کرام اور ائمۂ عظّام کے سلسلۂ ہدایت کی برگزیدگی کا تذکرہ ہے اور ظاہر ہے کہ ہدایت کی ضرورت قیامت تک باقی ہے، لہٰذا پورے دَور کو چار حصّوں پر تقسیم کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہ جہان اور زمانہ ربّانی ہدایت سے کبھی خالی نہیں رہا، اور نہ کبھی خالی ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے دنیا والوں سے حضرتِ آدمؑ اور اس کی نسل کے جانشینوں کو منتخب کیا تاکہ وہ اپنے دَور میں لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کریں، پھر اسی طرح

حضرتِ نوحؑ اور اس کے سلسلے کے وارثوں کو، ان کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل کو، اور اخیر میں حضرتِ عمران یعنی ابوطالبؑ کو اور آپ کی آلِ پاک کو برگزیدہ کیا تاکہ فیضِ ہدایت سے دُنیا کبھی خالی نہ ہو اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری اور باقی ہے۔

اگر ہم اس کے برعکس آیۂ اصطفا میں مذکورہ عمران سے مُوسٰیؑ کے والد کو یا عیسٰیؑ کے نانا کو مُراد لیں، تو یہ بات ہرگز دُرست نہ ہوگی، ایک تو اس لئے کہ برگزیدگی اور انتخاب کا یہ سلسلہ اور قصۂ آنحضرتؐ کے پاک خاندان سے الگ اور بہت پہلے ختم ہو جائے گا، حالانکہ ان چار برگزیدہ حضرات میں سے آخری شخص سرورِ انبیاء مُحمّد مصطفٰےؐ کے خاندان سے ہونا چاہئے دُوسری وجہ یہ ہے کہ جب کارِ ہدایت کے اس خُدائی پروگرام سے ظاہر ہے کہ پُورے دَور کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اسی طرح اس دَور میں جو سلسلۂ ہدایت قیامت تک جاری و باقی ہے اس کے بھی چار حصّے کئے گئے ہیں، اور اس سلسلے کے ہر حصّے کے شروع میں ایک عظیم شخصیّت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو یہ پھر کیسے ممکن ہے کہ ہدایت کا چوتھا اور آخری سلسلہ صرف انبیائے بنی اسرائیل میں محدُود ہو اور اس جامع آیت میں خاندانِ مُحمّد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا کوئی ذکر نہ ہو۔

اگر کوئی شخص یہ کہتا ہو کہ حضورِ اکرمؐ اور آپؐ کے پاک خاندان کا ذکرِ جمیل یعنی برگزیدگی کا تذکرہ آلِ ابراہیمؑ کے ساتھ ساتھ آچکا ہے، تو میں جواب دوں گا کہ اگر یہ بات تمہاری قطعی دلیل ہے تو اس کے بموجب بنی اسرائیل میں سے کوئی عمران یہ عمران نہیں ہو سکتا ہے جس کی آل کی برگزیدگی کا یہاں ذکر ہے ظاہر ہے کہ معترض کا سوال غلط ہے، اور آنحضرتؐ کے آلِ ابراہیمؑ میں سے

ہونے میں ذرا بھی شک نہیں، مگر یہاں برگزیدگی پر برگزیدگی ہوئی ہے۔

اَب مناسب ہے کہ حضرتِ ابوطالب علیہ السّلام کی عظمت و بزرگی کے بارے میں کچھ ذکر کیا جائے، چنانچہ جاننا چاہیئے کہ نظریّہ اسماعیلیت کے مطابق نورِ امامت کا ظہور بتقاضائے زمان و مکان کئی درجات میں ہوتا ہے، جیسے امامِ مُقیم، امامِ اساس، امامِ مُتم، امامِ مُستقر اور امامِ مستودع، اور ان درجات میں سے عظیم درجہ امامِ مقیم کا ہے۔

آپ چاہیں تو اس مطلب کے لئے کتاب "الامامۃ فی الاسلام" کے صفحہ ۱۴۳ کو دیکھیں، اسی کتاب کے صفحات ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۳، اور ۱۵۵ پر تحریر ہے کہ زمانۂ آدمؑ کے امامِ مقیم مولانا ہُنید علیہ السّلام تھے، نوحؑ کے عہد میں مولانا ہودؑ، ابراہیمؑ کے وقت میں مولانا تارحؑ، مُوسیٰؑ کے ساتھ مولانا اُدؑ، عیسےٰؑ کے لئے مولانا خزیمہؑ، اور آنحضرتؐ کے واسطے امامِ مقیم حضرتِ عمران تھے یعنی ابوطالبؑ، ان میں سے ہر امامِ مقیم نے اپنے دَور کے پیغمبرِ ناطق کو رُوحانی تعلیمات سے آراستہ کرکے تیار کیا، امامِ مقیم کے معنی میں غور کیا جائے۔

سلیمان پیغمبرؑ:-

سوال ۸۴: کہا جاتا ہے کہ حضرتِ سلیمان علیہ السّلام کو ایک ایسی معجزانہ انگوٹھی دی گئی تھی کہ اس کی وجہ سے آپؑ جنّ و انس اور وحش و طیر پر سلطنت کرتے تھے اور آپ کا تخت ہَوا پر چلتا تھا، یہ باتیں کہاں تک دُرست ہیں؟

جواب: (الف) یہ باتیں سب کی سب صحیح ہیں مگر تاویلی صورت میں،

اور وہ یہ کہ انگوٹھی سے اسمِ اعظم مُراد ہے۔ جو نہ صرف حضرت سلیمان علیہ السّلام کو حاصل تھا بلکہ ہر پیغمبر اور ہر امام کے پاس ہوتا ہے، جن و انس وغیرہ پر بادشاہی اور تخت کا ہوا پر چلنا رُوحانیت میں تھا، نہ کہ ظاہر میں، اور تمام انبیاء و ائمّہ کی رُوحانیت ایسے عجائبات سے بھرپُور ہوتی ہے۔

(ب) قرآنِ حکیم کا اشارہ (۲/۲۸۵) یہ ہے کہ بڑے بڑے پیغمبروں اور اماموں کی رُوحانیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کی رُوحانیت مُشترک ہُوا کرتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایک دُوسرے کے مرتبے سے بے خبر ہوتے اور معرفت کے الگ الگ ٹکڑے ہوتے اور کسی ایک کی بھی رُوحانیت و معرفت کامل نہ ہوتی۔

(ج) انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام تو رُوحانیت کے شاہنشاہ ہُوا کرتے ہیں ان کی کامل اور مکمّل رُوحانیت کے بارے میں کسی دانشمند کو کیا شک ہو سکتا ہے، ہم صرف ایک حقیقی مومن کی روحانیت کا ذکر کریں گے، کہ وہ نہ تو کوئی پیغمبر ہے اور نہ ہی کوئی امام، مگر وہ صراطِ مُستقیم کا ایک مُسافر تھا، اس نے معرفت کے درجۂ کمال کو حاصل کر لیا، چونکہ معرفت انبیاء و ائمّہ کے بعد مومنین کے لئے وقف ہے، اَب آپ خود اندازہ کریں کہ اِس مومن کی کامل اور مکمّل معرفت کے کیا معنی ہوتے ہیں، معرفت پہچان کو کہتے ہیں اور پہچان مشاہدات کا نتیجہ ہُوا کرتی ہے، پھر سوال ہے کہ اُس عارف نے جو معرفت حاصل کی اس کا احاطہ کیا ہے اور اس احاطے میں کس کس کی معرفت آگئی اور کون سی معرفت باقی رہ گئی، ظاہر ہے کہ جب یہ معرفت کامل ہے تو کوئی معرفت اِس سے باہر نہ رہی۔

(د) اِس بیان کا اشارہ یہ ہے کہ پیغمبروں اور اماموں کی رُوحانیت اور کہیں نہیں صرف اور صرف صراطِ مُستقیم پر واقع ہے، لہٰذا جو مومنین ان کی مکمل پیروی

کرتے ہیں تو وہ اُن تمام رُوحانی واقعات کو دل کی آنکھ سے دیکھتے ہیں جو انسانِ کامل کے مرتبے سے متعلق ہیں، اور کامل معرفت کے یہی معنی ہیں۔

(۵) یہ اُصول یاد رہے کہ رُوحانیّت دراصل اپنی جامعیّت میں ایک ہی ہے، لیکن بمقتضائے حکمت انبیاء علیہم السّلام کے ایک جیسے معجزات کو نمایاں کرنے کے لئے جُدا جُدا تشریحات کی گئی ہیں، جس کی وجہ سے ظاہر میں یوں لگتا ہے، جیسے صرف حضرتِ آدمؑ ہی کو فرشتوں نے سجدہ کیا، کشتی صرف حضرتِ نوحؑ کی تھی، آگ سے گلشن نہیں بنا مگر حضرتِ ابراہیمؑ کو، لاٹھی کا معجزہ صرف حضرتِ موسیٰؑ کا تھا، حضرتِ عیسیٰؑ کے سوا اور کوئی مُردوں کو نہیں جلا سکتا تھا اور واقعۂ معراج کا تعلّق صرف آنحضرتؐ سے ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ رُوحانیت مشترک ہُوا کرتی ہے، اور سب معجزات اصل میں ایک ہیں، مگر ان کی تشریحیں الگ الگ ہیں۔

کُتبِ سماوی:-

سَوال ۸۵ء : اِن آسمانی کتابوں کے لفظی اور تاویلی معنی کیا ہوتے ہیں؛ صحف، تورات، زبور اور انجیل؟

جَواب : (الف)، صُحف صحیفہ کی جمع ہے، اور صحیفہ کے بنیادی معنی ان الفاظ میں موجود ہیں؛ الصّحیفُ (روئے زمین)، الصّحیفۃُ پھیلی ہُوئی چیز، صحیفۃُ الوَجہِ چہرے کا پھیلاؤ، الصّحیفۃُ (بڑا پیالہ، پھیلا ہُوا چوڑا پیالہ)، البتہ اسی کشادگی اور پھیلاؤ کی مناسبت سے صحیفہ کے معنی لکھی ہوئی چیز یعنی کاغذ، ورق کے ہُوئے اور صُحف کے معنی ہُوتے لکھے ہُوتے اوراق۔

صُحف کی تاویل (پھیلی ہُوئی چیز اور لکھے ہُوئے اوراق کے اعتبار سے) رُوح اور رُوحانیت کے کلماتِ تامات ہیں، جن میں سے ہر کلمہ ایک عظیم اور پاک رُوحانی ورق ہے، جس کی معنوی اور تاویلی وُسعت و کشادگی بہت زیادہ ہے۔

(ب)، تورات کے لغوی معنی کی بابت دو قول ہیں، ایک قول کے مطابق یہ (تورات) لفظ تَوْرَہْ کا مُعرّب (عربی بنالیا گیا) ہے اور تورہ کے معنی عبرانی میں شریعت اور حکم کے ہیں، تورات اس کی جمع ہے بمعنیٔ احکام و شرائع۔

دُوسرے قول کے اعتبار سے یہ لفظ وَرْیٌ سے مشتق ہے، اور اس مادہ میں چُھپنے اور ظاہر ہونے کے دونوں معنی پائے جاتے ہیں جیسے کہ ان لفظوں سے یہ مطلب ظاہر ہے:

حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (۳۲/۳۸) (یہاں تک کہ پردے میں چھُپ گیا)، یُوَارِی ۳۱/۵ (چھپاتے)، اَلنَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ (۵۶/۷۱) (وہ آگ جسے تُم روشن کرتے ہو) فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا (۱۰۰/۲) (وہ گھوڑے جن کے ٹاپ مارنے سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں، حدیث میں ہے: انّ النّبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کان اذا اَرادَ غزوًا وَرّٰی بغیرہٖ (کہ آنحضرت جب کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تو "تَوْرِیَۃ" سے کام لیتے، اور توریہ یہ ہے کہ اصل بات کو چُھپاکر اسے کسی اور طریقہ سے ظاہر کیا جائے اس طور پر کہ جھوٹ بھی نہ ہو اور اصل مقصد بھی ظاہر نہ ہونے پائے)، وَرَایِ الزَّنْدُ (چقماق سے آگ نکلی)، وَرّٰی تَوْرِیَۃً (چُھپانا، دکھانا)۔

مذکورہ مثالوں سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ تورات کے معنی ظاہر باطن کے ہیں، یعنی حضرتِ مُوسیٰؑ کی آسمانی کتاب نہ صرف ظاہر میں تھی بلکہ وہ باطن میں بھی موجُود تھی، اور تورات کا جو پہلو باطنی اور رُوحانی تھا، اسی میں ہدایت اور

نور تھا، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے؛

ہم نے توریت نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے (۵/۴۴)

(ج)، زبور کتاب کو کہتے ہیں، جیسے: اَلزَّبْرُ (لکھنا)، مِزْبَرُ (قلم)، زَبِیْرُ (تحریر)، زِبرج زُبُور (کتاب، عقل)، زَبُور، مَزْبُور (لکھی ہوئی چیز، کتاب)، اس کی جمع زُبُرُ ہے، بعض کا کہنا ہے کہ زبور کتبِ الٰہیہ میں سے ہر اس کتاب کو کہتے ہیں جس پر واقفیت دشوار ہو، اور بعض کہتے ہیں کہ زبور اُس کتاب کا نام ہے جو صرف حِکَمِ عقلیہ (عقلی حکمتوں)، پر مشتمل ہو اور اس میں احکامِ شرعیہ نہ ہوں اور الکتاب ہر اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو احکام و حِکَم دونوں پر مشتمل ہو، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرتِ داؤد علیہ السّلام کی زبور میں کوئی حکم شرعی نہیں ہے۔

(راغب)

اس سے معلوم ہوا کہ زبور وہ آسمانی کتاب ہے جس سے واقفیت و آگہی مشکل ہے کیونکہ اس میں عقلی حکمتوں پر زور دیا گیا ہے، اور اِس سلسلے کی سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ زبور میں خودی اور خدائی کے عظیم اسرار پوشیدہ تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے حضرتِ داؤدؑ کو زبور اس طرح دی کہ رُوحانی اور نُورانی قوتوں کے تحت آپؑ کے دل و دماغ سے کام لے کر آپ ہی کی زبان سے یہ آسمانی کتاب کہلائی گئی، اور اس امر میں معرفت کے بہت سے بھید پنہاں ہیں، اس حقیقت سے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے۔

بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر ہوئے اُن پر داؤدؑ اور عیسیٰؑ ابنِ مریم کی زبانی لعنت کی گئی ہے یہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے نافرمانی کی اور حد سے بڑھ جاتے تھے (۵/۷۸) اِس فرمانِ خداوندی سے کئی حکمتیں اُجاگر ہو جاتی ہیں، سب سے پہلے یہ کہ حضرتِ داؤد علیہ السّلام اپنے وقت میں خُدا کی بولنے والی زبان تھے،

چُنانچہ ایسی خُدائی زبان کو یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ صرف نافرمانوں پر لعنت ہی کے لئے مقرر ہو بلکہ ہونا یہ چاہیئے کہ دُوسری جانب سے فرمانبرداروں پر رحمت بھی اسی سے ہو، یقیناً ہادیٔ برحق جو لسان اللہ کا عظیم مرتبہ رکھتا ہے وہ ایسا ہی ہُوا کرتا ہے، پس ظاہر ہے کہ زبور حضرتِ داؤدؑ کی زبان سے کہلائی گئی تھی۔

(د) انجیل کے بارے میں بعض اہلِ لُغت کا کہنا ہے کہ یہ لفظ یونانی لفظ اِوَنْجِلْیُوْنُ کا معرّب ہے، جس کے معنی مسرت انگیز خبر یا بشارت ہیں، بعض اس کو نَجَلَ کے عربی مادہ کے تحت لکھتے ہیں، اور نَجَلَ کے ویسے تو بہت سے معانی ہیں، لیکن بعض کے مطابق یہی صحیح ہے کہ اَلْاِنْجِیْلُ، نَجَلْتُ الشَّیْءَ سے ہے جس کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ظاہر کر دیا، اور اس کے مفہوم میں پھر وہی بات ہے جو تورات سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ کتابِ سماوی کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہُوا کرتا ہے، جیسا کہ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:۔

وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (۳۱/۲۰) اور خُدا نے تُم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پُوری کر دی ہیں۔ چُنانچہ انجیل جب تک آسمانی کتاب کی حیثیّت سے کسی تحریف کے بغیر اپنی اصلی حالت میں تھی تب تک اس کے ظاہر و باطن میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہونے میں کسی دیندار کو کیا شک ہو سکتا ہے، کیونکہ ربّ العالمین کی عظیم نعمتیں تو علم و حکمت ہی کی صورت میں ہُوا کرتی ہیں۔

نیز فرمایا گیا ہے کہ: اور (اے مریمؑ) خُدا اس (عیسیٰؑ) کو الکتاب و حکمت اور تورات و انجیل سکھا دے گا (۳/۴۸) یہاں پر یہ حقیقت روشن ہے کہ پروردگارِ عالم کی جانب سے یہ ساری تعلیمات حضرتِ عیسےٰؑ کو صرف باطنی اور رُوحانی طریق پر حاصل تھیں، چونکہ آپ کو رُوح القدس کی تائید روحانیت کے وسیلے سے

میسر ہوتی رہتی تھی۔

امامؑ کا دیدار :-

سوال ۸۶ : اسماعیلی مذہب میں امامِ زمانؑ کے ظاہری دیدار کی اتنی اہمیّت کیوں ہے؟ اِس میں کیا فضیلت ہے؟

جواب : (الف) جب پیغمبرِ برحقؐ خلیفۂ خُدا ہیں اور امامِ زمان خلیفۂ رسُول، تو امام کا پاک دیدار آنحضرتؐ کا دیدار ہے اور حضورِ اکرمؐ کا دیدار خُدا تعالیٰ کا دیدار۔

(ب) جن حضرات کے امر و فرمان کی اطاعت اللہ پاک کی اطاعت ہو تو ان کا دیدار بھی اللہ تعالیٰ کے دیدار کا قائم مقام ہوتا ہے، آپ قرآن میں امر اور اطاعت کے موضوع کو ذرا غور سے پڑھیں۔

(ج) سیّدنا قاضی نعمان نے کتابِ الھمہ فی آدابِ اتباعِ الائمہ کے صفحہ ۴۶ پر یہ حدیثِ مرفوع درج کیا ہے کہ :-

اَلنَّظرُ اِلیٰ وجہِ الامام عبادۃٌ،
وَالنَّظرُ اِلی المصحفِ عبادۃٌ۔

یعنی چہرۂ امام کی طرف دیکھنا عبادت ہے اور قرآن کی طرف دیکھنا عبادت ہے، ظاہر ہے کہ عقیدت و محبّت سے امام اور قرآن کی طرف دیکھنے میں عبادت ہے۔

(د) قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن مومنین کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، لیکن سوال ہے کہ یہ پاک دیدار کس طرح ہوگا، کیونکہ ذاتِ سبحان بیچون اور غیر مرئی ہے یعنی وہ دکھائی دینے والا نہیں؟ سو اس کا جواب ہے کہ یہ عالی شان دیدار پیغمبرؐ اور امامؑ کی

پاک صُورت میں ہوگا، اس لئے کہ انسانِ کامل کی صورت رحمان کی صُورت قرار پاتی ہے۔

(ہ) یہ واقعہ مشہور ہے کہ آدمؑ (جو اپنے وقت کا انسانِ کامل تھا) کو رحمان کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرتِ آدم اور ان کے قبل کے انسانِ کامل کی صُورت کو خُدا کی صورت کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کے معنی یہ نہیں کہ کسی انسان کی طرح رحمان کی کوئی مخصوص شکل تھی جس کے مطابق آدم کو پیدا کیا گیا۔

(و) قرآن کا ارشاد ہے کہ خُدا نے اپنی رُوح آدم میں پھونک دی، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خُدا تعالیٰ کی اپنی کوئی رُوح ہے، وہ تو ہر چیز سے برتر و بے نیاز ہے، اس کے لئے اس کے معنی یہ ہیں کہ آدم سے پہلے جو پیغمبر اور امام تھا اس کی رُوح خُدا کی نمائندگی کے اعتبار سے گویا خُدا کی رُوح تھی، وہی رُوح آدم میں پھونکی گئی تھی۔

(ز) حضرتِ عیسٰےؑ کو رُوح اللہ کہا جاتا ہے، مگر یہ حقیقت جاننا چاہیئے کہ ہر پیغمبر اور ہر امام روح اللہ ہے، اسی طرح ہر پیغمبر اور ہر امام چہرۂ خدا بھی ہیں، اور ان کا دیدار خُدا کا دیدار ہے۔

(ح) ان تمام باتوں سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت پر پہنچ گئی کہ مظہرِ نورِ الٰہی کے دیدار کی بہت بڑی اہمیت ہے اور اس میں بہت بڑی فضیلت ہے، لہٰذا بڑے مُبارک ہیں وہ حضرات جن کو امامِ زمانؑ کے دیدارِ ظاہر اور دیدارِ باطن کا بھرپُور شوق وجذبہ ملا ہے۔

خانۂ کعبہ :-

سوال ۸۷ : خانۂ کعبہ کن معنوں میں خُدا کا گھر کہلاتا ہے؟ جبکہ وہ ایک جسمانی مکان ہے اور اللہ تعالیٰ مکان ولامکان سے برتر و بے نیاز ہے؟ اور قبلہ کی طرف مُنہ کرنے کی کیا تاویل ہوتی ہے؟

جواب : (الف) خانۂ کعبہ اللہ پاک کا گھر اس لئے ہے کہ ربّ العزّت نے خود ہی قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہ میرا گھر ہے، پس اِس مبارک و مُقدّس مقام کے خانۂ خُدا ہونے میں کوئی شک نہیں۔

(ب) یقیناً ذاتِ سُبحان خود مکان اور لامکان سے برتر اور بے نیاز ہے، مگر "بیت اللہ" کی اِس مثال میں خُدا شناسی کی جو حکمتیں پوشیدہ ہیں وہ اتنی عظیم اور اس قدر اعلیٰ ارفع ہیں کہ ان کے جاننے سے مومن کو خُدا مل جاتا ہے، معرفت کے اِن بھیدوں کا جاننا ایسا ہے جیسے صحیح معنوں میں خُدا کے گھر میں داخل ہو جانا، لہٰذا یہ پاک مقام اِس معنیٰ میں خانۂ خُدا ہے۔

(ج) خانۂ کعبہ کا سب سے بڑا راز، اصل اشارہ اور بُنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ خُدا کے حقیقی اور معمور گھر کی مثال ہے، جو زندہ اور علم و حکمت کا سرچشمہ اور رُشد و ہدایت کا مرکز ہے، جس میں واقعی نورِ خُداوندی جلوہ افروز ہے اور یہیں سے خُدا کی معرفت یعنی پہچان حاصل ہوتی ہے، اور وہ تمام چیزیں ملتی ہیں جو اللہ کے حقیقی گھر سے ملنے والی ہیں، خُدا کا ایسا گھر عہدِ نبوّت میں پیغمبرِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تھے اور آپؐ کے بعد ہر زمانے میں امامِ وقت علیہ السّلام کو یہ درجہ حاصل ہے۔

(د) حدیثِ قدسی کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ تو آسمان اپنے اندر سمو سکتا ہے اور نہ ہی زمین، مگر صرف بندۂ مومن کا دل ہی اس کو سمو لیتا ہے۔ اِس ارشاد سے دو حقیقتیں روشن ہو کر سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ جب حق تعالیٰ آسمان و زمین میں نہیں سموتا تو وہ عرش اور خانۂ کعبہ میں بھی نہیں سموتا ہے، اور دُوسری یہ کہ اگر وہ کسی مومن کے قلب میں سموتا ہے تو سب سے پہلے مومنوں کے سردار اور انسانِ کامل یعنی امامِ برحق کے پاک و پاکیزہ دل میں ضرور اور یقیناً سمو جاتا ہے، اِس سے یہ مطلب صاف طور پر ظاہر ہے کہ صحیح معنوں میں انسانِ کامل ہی خُدا کا وہ گھر ہے جس میں کہ خُدا تعالےٰ کا سب کچھ موجود ہے۔

(ہ) جب خانۂ کعبہ اِس معنیٰ میں امام کی تاویلی مثال ہے اور امامِ زمان اس کا ممثول ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خُدا کا شرعی گھر قبلۂ ظاہر ہے اسی طرح اس کا حقیقی گھر قبلۂ باطن ہے، چُنانچہ امورِ شریعت میں خانۂ کعبہ کی طرف مُنہ کر لینے کی یہ تاویل ہے کہ امورِ حقیقت میں قبلۂ باطن کی طرف توجہ دی جائے اور قبلۂ باطن امامِ زمان صلوات اللہ علیہ ہیں۔

یُوسفؑ کا کُرتا:-

سوال ۸۸ : آپ ہمیں حضرتِ یُوسف علیہ السّلام کی قمیص کے بارے میں کچھ مفید باتیں سمجھا دیجئے کہ وہ کیا چیز تھی؟ آیا وہ واقعاً ایک عام ظاہری کُرتا تھا؟ یا بہشت کا کوئی لباس؟

جواب : جاننا چاہئے کہ حضرتِ یعقوب علیہ السّلام اپنے زمانے میں امامِ مستودع تھے، اور جیسا کہ قِصّۂ قرآن سے ظاہر ہے کہ حضرتِ یوسف علیہ السّلام نے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے، سُورج اور

چاند آپ کو سجدہ کر رہے تھے، جس کی تاویل ہے کہ عنقریب اور وقت سے پہلے یعنی والدِ محترم کی زندگی ہی میں مرتبۂ امامت ان کو ملنے والا تھا، کیونکہ آپ کو گیارہ ستاروں کے سجدہ کرنے کے معنی ہیں کہ کُل بارہ حُجتوں میں سے ایک حُجت آپ خود تھے اس لئے گیارہ نے آپ کی تابعداری کی یعنی آپ اُن تمام حُجتوں سے آگے بڑھ گئے، پھر چاند نے سجدہ کیا، یعنی باب (حُجتِ اعظم) نے تابعداری کی اور آخر میں سُورج نے سجدہ کیا، یعنی امامِ سابق نے نورِ امامت اپنے فرزند کو دے کر اس کے اختیار کو تسلیم کر لیا، یہ ہوئی وہ تاویل جو حضرت یُوسفؑ کو گیارہ ستاروں، چاند اور سُورج کے سجدہ کرنے سے متعلق ہے۔

خوب یاد رہے کہ یُوسف علیہ السّلام کی قمیص سے جسمِ لطیف مُراد ہے، ہم نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ جسمِ لطیف کا ذکر کیا ہے، جسمِ لطیف دراصل امامِ زمان ہی کا ہے، جو تمام ظاہری و باطنی معجزات کا مرکز ہے، وہ انتہائی چھوٹے چھوٹے لاتعداد نُورانی ذرّات پر مشتمل ہے، اس کا ذرّہ ذرّہ زندہ اور بولتی رُوح ہے، یہ معجزانہ قمیص چاہے تو انسانِ کامل کی صُورت میں مشخص ہو جاتی ہے مگر اکثر ذرّات کی شکل میں منتشر رہتی ہے۔

جسمِ لطیف کے بہت سے نام ہیں، اور اس کا ایک نام جُثۂ ابداعیہ ہے، جُثّہ جسم کو کہتے ہیں اور ابداع ایسے پیدا کرنے کو کہتے ہیں جس میں تخلیق کی طرح کوئی وقت نہیں لگتا، کیونکہ وہ "کُن فیکون" کا مقام ہے، ابداع صرف امر ہی سے ظہور پذیر ہو جاتا ہے، چنانچہ جسمِ لطیف جُثّۂ ابداعیہ ہے یعنی ہر طرح کی معجزاتی صلاحیتوں سے بھر پُور۔

قرآنی حکمت کی زبان سے ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ امامِ وقت کے نُورانی دیدار کے لئے ایک مدّت تک رویا کرتے تھے اور اس سے ان کی

آنکھیں سفید سفید ہُوئی تھیں، جس کی تاویل ہے کہ ان کی باطنی آنکھوں کے سامنے دیدار کے بغیر سفید روشنی تھی، اور جب ان کے چہرے پر یُوسفؑ کی قمیص ڈالی گئی تو وہ بینا ہو گئے، یعنی جب امامِ زمان کا پیکرِ نورانی (جسمِ لطیف) ان کے سامنے آیا تو اُنہوں نے اس کا دیدار حاصل کر لیا۔

اگر ہم اس تاویلی حکمت کے بغیر قصّہ اور روایت کے ظاہری پہلو پر نظر رکھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ (نعوذ باللہ) انبیا و ائمّہ علیہم السّلام بھی عام آدمیوں کی طرح اپنی اولاد کی جسمانی جُدائی پر رو رو کر بینائی کو کھو بیٹھتے ہیں، اور اگر یہ واقعہ دُرست ہو تو وہ حضرات کس طرح بنی نوعِ انسان کی ہدایت و رہنمائی کر سکتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ اصل واقعہ تاویل میں پوشیدہ ہے اور وہ اس طرح سے ہے جیسے اُوپر اس کا ذکر ہُوا۔

آدابِ دُعا۔

سَوال ۸۹: کیا آپ آدابِ دُعا کی مختلف حرکتوں کے بارے میں کچھ وضاحت کریں گے؟

جَواب: دَورانِ دُعا ہم جس طرح دونوں ہتھیلیوں کو کھول کر ہاتھ اُٹھاتے ہیں، وہ ہماری طرف سے خُدا کے حضور میں اظہارِ محتاجی کی علامت ہے۔

دُعا کے ہر حصّے کے اختتام پر سجدہ کرنا اس بات کی نشانی ہے کہ بندۂ مومن بہت ہی عاجز ہے، نیز اس کے معنی ہیں کہ یہ خاکسار بندہ مٹّی سے بنایا گیا ہے اور جسم کے اعتبار سے مٹّی میں جانے والا ہے، اور اس کی تاویل یہ بھی ہے کہ پیغمبر کے زمانے میں پیغمبرؐ کی اطاعت ضروری ہے اور امام کے

دَور میں امامِ زمان کی اطاعت لازمی ہے، کیونکہ سجدہ کی تاویل پیغمبر اور امام کی اطاعت ہے (کتابِ "وجہ دین" کی تاویلات کو دیکھو)۔

جب مُقدّس دُعا اپنے تمام اجزاء کے ساتھ مکمل ہو جاتی ہے تو آخری سجدہ سے پہلے "شاہ دیدار" کہتے ہُوئے مُصافحہ کرتے ہیں، جس کی تاویل ہے امامِ زمان کا دیدار، جو دیدارِ الٰہی کا مظہر ہے اور یہ شاہ دیدار دائیں بائیں والے ساتھیوں کے ساتھ اس لئے کیا جاتا ہے کہ دینی بادشاہ کے مُقدّس دیدار کا تصوّر عہدِ نبوت میں بھی تھا اور زمانۂ امامت میں بھی ہے، چونکہ دائیں طرف کا اشارہ ہے پیغمبر اور بائیں طرف کی تاویل ہے امام۔

نیز اس دونوں طرف کے "شاہ دیدار" میں بزبانِ حکمت یہ فرمایا گیا ہے کہ تُم شاہنشاہِ دین کے دیدارِ باطن اور دیدارِ ظاہر دونوں کو مانو اور دونوں کو حاصل کرو، کیونکہ دائیں طرف کی تاویل ہے باطن جو پیغمبر کا مرتبہ ہے اور بائیں جانب کی تاویل ہے ظاہر، جو امام کا درجہ ہے۔

اس کے بعد مومن کلمۂ شہادت پڑھتے ہُوئے دائیں ہاتھ سے یہ اشارہ کرتا ہے کہ آفاق و انفس (عالمِ جسمانی اور عالمِ رُوحانی) دونوں گواہ رہیں، کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت، حضرتِ محمدؐ کی نبوت و رسالت اور حضرتِ مولانا علیؑ کی ولایت و امامت کے برحق ہونے کی گواہی دے رہا ہے، کیونکہ اِس انداز میں زمین کو چھُونا آفاق کو گواہ بنانا ہے، اور چہرے پر ہاتھ پھیر لینا عالمِ نفسی کو شاہد بنانا ہے، جیسا کہ قرآنِ حکیم (۵۱/۱۸) میں اس کا اشارہ ملتا ہے۔

نیز اس کی یہ تاویل بھی ہے کہ بندۂ مومن نے دُنیا میں آکر خُدا اور رسُولؐ اور امامِ برحقؑ کے لئے اقرار کیا، اور پھر اِس اقرار کے مطابق عمل کرکے دین و دُنیا کے فیوض و برکات کا خواستگار ہوا، کہ زمین کو چھُونے کا اشارہ دنیا میں

آنے کی طرف ہے اور مُنہ پر ہاتھ پھیر لینے کے معنی ہیں فیوض و برکات کا خواستگار ہوجانا۔

آخر میں دائیں بائیں جانب کو "حیّ زندہ۔ قیّوم پائندہ" کہا جاتا ہے، جس کی عظیم حکمت یہ ہے کہ قرآن (۲/۲۵۵) میں اللہ تعالیٰ کے دو سب سے بُزرگ ناموں کی تعریف و توصیف کی گئی ہے جو "الحیّ القیّوم" ہیں، جن کے بارے میں یہاں حکمت کی زبان میں یہ کہا گیا ہے کہ خُداوند تعالیٰ کا وہ اسمِ اعظم جو "الحیّ" کہلاتا ہے، دُنیا میں زندہ اور حاضر و موجود ہے، اور "القیّوم" جو خُدا کا دُوسرا اسمِ اعظم ہے وہ بھی ہمیشہ دنیا میں موجود ہے، اور حکمت کے یہ دونوں اِشارے امامِ زمان صلواتُ اللہ علیہ کی طرف ہیں۔

ہونزائی گنان :-

سوال ۹۰ : یہاں تو پیروں کے گنان پڑھے جاتے ہیں لیکن مَیں یہ جاننا چاہتا ہُوں کہ ہونزہ میں کس زبان کے گنان پڑھے جاتے ہیں ؟ کیا وہاں ہونزائی زبان میں گنان پڑھتے ہیں ؟

جواب : ہونزہ میں پہلے تمام گنان منقبت، قصیدہ وغیرہ کے نام سے فارسی میں پڑھے جاتے تھے، لیکن آج کل یہ گنان اکثر ہونزائی زبان میں پڑھتے ہیں، اور یہ سلسلہ ہونزہ کے علاوہ گلگت کے اُن مقامات میں بھی جاری ہے جہاں کے اسماعیلی ہونزہ سے آکر آباد ہُوئے ہیں۔

اگرچہ قدیم ہندوستان کی اسماعیلی دعوت سے منسلک جماعتوں کے لئے یہ ایک شاندار اور کامیاب روایت رہی ہے کہ صرف پیروں ہی کے

منظُوم کلام کو بطورِ گِنان پڑھا جاتے، تاہم جن ممالک میں پیر ناصر خسرو ق س کی دعوت کو فروغ حاصل ہُوا ہے وہاں ایسا کوئی اختصاص نہیں ہے، بلکہ امام اور مذہب کی شان میں جو بھی عُمدہ اور قابلِ فہم نظم ہو وہ جماعت خانے میں بطورِ منقبت یا بطورِ گنان پڑھی جاتی ہے۔

میرا اس بات پر پُورا پُورا یقین ہے کہ مذکورۂ بالا دونوں قسم کی روایتیں امامِ برحق ع کی نظر میں پسندیدہ اور منظور ہیں اور ان میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں جن کی وضاحت اِس سوال کی حد سے باہر ہے۔

تصوّرِ امامت :-

سوال ۹۱ : کیا آپ اسماعیلی نقطۂ نگاہ کے مطابق تصوّرِ امامت اور امام کے کردار کے بارے میں کچھ وضاحت کریں گے؟ اِس کے علاوہ یہ بھی واضح ہو کہ عام طور پر اسماعیلی ہونے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

جواب : (الف) ظاہر ہے کہ یہاں تین سوال کیئے گئے ہیں، مگر ان کی بنیاد ایک ہی ہے، سو جاننا چاہیئے کہ دینِ اسلام میں امامت خلافتِ الٰہیّہ کا دُوسرا نام ہے، لہٰذا تصوّرِ امامت تصورِ خلافت ہے، جس کا ذکر قرآن میں نمایاں طور پر فرمایا گیا ہے، چُنانچہ خود حضرتِ آدم علیہ السّلام کی خلافت ہی امامت تھی، کیونکہ اِن دونوں لفظوں کے اصطلاحی معنی ایک ہی ہیں اور ان کا مقصد بھی ایک ہی ہے وہ اس طرح کہ حقیقت میں جو شخص خُدا کا نائب و جانشین (خلیفہ) ہوتا ہے صرف وہی شخص لوگوں کا سردار اور پیشوا (امام)، ہو سکتا ہے۔

(ب) حضرتِ آدم علیہ السّلام اپنے وقت میں خُدا کا خلیفہ تھا اور لوگوں کا امام، اور ان دونوں اصطلاحوں کا مطلب ایک ہی ہے، اسی طرح حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام اپنے زمانے میں لوگوں کا امام تھا اور خدا کا خلیفہ، کیا آپ قرآنِ پاک میں نہیں دیکھتے ہیں کہ آدمؑ کو خلیفہ اور ابراہیمؑ کو امام کہا گیا ہے، اس کا اشارہ یہ ہے کہ جس طرح ابراہیمؑ میں خُدا کی نمائندگی (خلافت) اور لوگوں کی پیشوائی (امامت) ایک ہے اسی طرح مان لیا جائے کہ آدم میں بھی یہ دونوں نام یعنی خلافت و امامت ایک ہیں۔

(ج) اگر حضرتِ آدمؑ اور حضرتِ نوحؑ اپنے اپنے وقت میں خُدا کے نزدیک لوگوں کے سردار یعنی امام نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ (جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ہے ۳/۳۳) ان کو مُصطفےٰ یعنی برگزیدہ نہ کرتا، آپ کو جاننا چاہیئے کہ خُداوند تعالیٰ لوگوں میں سے جس کو منتخب کرتا ہے وہی لوگوں کا سردار یعنی امام ہوتا ہے، کیونکہ امام کے معنی سردار ہیں اور سردار وہی ہوتا ہے جو حقیقت میں منتخب ہونا چاہیئے۔

(د) کیا آپ غور نہیں کرتے ہیں کہ جب ہم عام طور پر امامؑ کو آنحضرتؐ کا جانشین مانتے ہیں اور امامت کو پیغمبرؐ کی جانشینی قرار دیتے ہیں تو اس صورت میں بھی اس کی وہی منطق بنتی ہے کہ امامؑ خلیفۂ رسُولؐ ہے اور رسُولؐ خلیفۂ خُدا، پھر امامؑ بواسطۂ پیغمبرؐ خُدا کا خلیفہ ہُوا، اور امامت خلافتِ الٰہیّہ ہوئی یہ حقیقت ہے کہ تصورِ امامت اصل میں خلافتِ الٰہیّہ ہے۔

(ہ) فرشتوں نے جس فساد و خونریزی کی پیش گوئی کرتے ہُوئے خلافتِ آدمؑ پر اعتراض اُٹھایا تھا اس میں اس جنگ و جدل کی طرف اشارہ تھا جو حق و باطل یعنی خلیفۂ خُدا اور اس کے ضد کے درمیان واقع ہو کر قیامت تک جاری رہنے والی تھی، اس سے ظاہر ہے کہ اس اعتراض کے پسِ پردہ حکمت

کی زبان سے یہ کہا گیا ہے کہ آدمؑ کا وہ مرتبۂ خلافت و امامت، دُنیا میں قیامت تک جاری و باقی رہے گا، چُنانچہ مسئلۂ خلافت و امامت کے بارے میں فساد و خونریزی کا پہلا واقعہ خود حضرتِ آدمؑ کے زمانے میں پیش آیا، آپ قرآن (۳۲-۲۷/۵) میں ہابیل اور قابیل کا قِصّہ پڑھیں، امام ہابیل علیہ السّلام حق پر تھا اور قابیل باطل پر، لیکن قابیل نے حضرتِ ہابیلؑ کو شہید کر دیا، پھر بھی حق کی فتح اور باطل کی شکست ہُوئی، وہ اس طرح کہ حق سے مُراد وہ نُور ہے جو امام ہابیلؑ میں جلوہ گر تھا، وہ خُدا کے حکم سے حضرتِ شیث علیہ السّلام میں منتقِل ہو گیا، اور ہمیشہ کے لئے زندہ اور باقی رہا، مگر قابیل جو ظلمت و تاریکی اور باطل کا مجسّمہ تھا وہ ہابیلؑ کے نُورِ مقدّس پر قابض نہ ہو سکا اور نہ ہی اُس کو بُجھا سکا، بلکہ راندۂ درگاہ اور لعنت کا مستحق قرار پایا۔

(۵) اب ہم امامِ عالی مقامؑ کے کردار کے بارے میں کچھ مختصر بیان کرتے ہیں کہ زمانہ اور دُنیا کے بدلتے ہُوئے حالات کے مطابق امام کے الگ الگ مراتب ہوتے ہیں، جیسے امامِ مقیم، امامِ اساس، امامِ مُتم، امامِ مستقر اور امامِ مستودع، لہٰذا اُن میں سے ہر درجے میں امامؑ کا کام ظاہری طور پر مختلف ہُوا کرتا ہے، جس کی تفصیل میں جانے کے لئے یہاں گنجائش نہیں ہے مختصر یہ کہ اگر نبوّت کا دَور ہے تو امامؑ بعض دفعہ اپنے سِلسلۂ نسب میں پیغمبری کا درجہ بھی رکھتا ہے، مگر دَورِ امامت میں یعنی حضرتِ خاتم الانبیاؐ کے بعد ایسا نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف خلیفۂ رسُولؐ کی حیثیت سے ہُوا کرتا ہے اور ہر حالت میں یعنی براہِ راست ہو یا بواسطۂ رسُولؐ جیسا کہ اُوپر ذکر ہو چکا ہے، امامؑ خلیفۂ خُدا کا عظیم درجہ رکھتا ہے جس کے معنی ہیں کہ امامِ برحقؑ امورِ دین کی ظاہری و باطنی ہدایت میں بحیثیتِ صاحبِ امر مختار و سرپرست ہُوا کرتا ہے۔

(ز) آپ سوال کا آخری حصّہ آتا ہے کہ: عام طور پر اسماعیلی ہونے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ جس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ اسماعیلی ایک ایسے مُسلمان اور مومن کا نام ہے جو خُدا اور رسُولؐ اور اولی الامر یعنی أئمۂ پاک کے امر و فرمان کے مطابق قرآن اور اسلام پر عمل کرتا ہے (۴/۵۹) وہ یقین رکھتا ہے کہ خلیفۂ رسُولؐ یعنی امامِ زمانؑ جو نورِ ہدایت ہے وہ اِس دُنیا میں ہمیشہ حاضر اور موجود ہے، اور اس کی مبارک ہستی کے بغیر دین کا کام نہیں چل سکتا ہے (۲۸/۵۷)، اس کا پختہ عقیدہ ہے کہ امامِ وقت نہ صرف قرآن کے نور (۵/۱۵) اور معلّم کی حیثیت سے ہے (۲/۱۵۰-۱۵۱)، بلکہ وہ خود قرآنِ ناطق بھی ہے (۴۵/۲۹)۔

چند اِشارات:-

سوال ۹۲: اِن امور کی کیا تاویل ہے: (الف) شاہ دیدار کرنا؟ (ب) ہاتھ کو زمین پر مسح کرنے کے بعد مُنہ پر پھیر لینا؟ (ج) دائیں بائیں طرف کو "حیّ" "زندہ" "قیّوم" "پائندہ" کہنا؟ (د) اگر بتّی جلانا؟ (ہ) اور موم بتّی روشن کر کے رکھنا؟

جواب: آپ کے سوال کے اجزاء الف، ب، ج کی تاویلات سوال ۸۹ کے تحت بیان کی گئی ہیں، اَب یہاں صرف "اگر بتّی" اور "موم بتّی" کے بارے میں کچھ وضاحت کی جاتی ہے کہ "اگر بتّی" جلانے کا مقصد ظاہر آیہ ہے کہ اس کی خوشبو سے جماعت اور رُوحانی محفل کا ماحول خوشگوار ہو اور خانۂ خُدا کی فضا مکدّر ہوا سے صاف اور مرغوب و پسندیدہ ہو جائے، اور اس کی باطنی حکمت یہ ہے کہ بندۂ مومن اپنی مالی، جسمانی اور دماغی قوّتوں کو قربان کر کے دُوسروں کے لئے راحت و خوشی مہیّا کر دے جس طرح اگر بتّی اپنی ہستی کی قربانی دے

کر اہلِ مجلس کے دل و دماغ کو تر و تازہ کر دیتی ہے۔

خُوشبو ایک ایسی عُمدہ، مُفید اور لطیف چیز ہے، جس کو سب پسند کرتے ہیں، اور اِس سلسلے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو خُوشبوئیں بہت پسند تھیں، کیونکہ اِس میں جسمانی راحت و لذّت کے علاوہ حکمت کے اعلیٰ اشارے بھی موجود ہیں۔

خُوشبو کا مادّہ کچھ زیادہ تو نہیں ہُوا کرتا، مگر وہ بہت سے لوگوں کو خُوش کر سکتا ہے، اسی طرح مومن کا ذرا سا قول و عمل جو نیک ہو سب کو خُوش کر دیتا ہے، اور نیک گفتار و کردار کی خُوشبو پوری دُنیا میں پھیل کر قائم رہتی ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتی۔

اعلیٰ کام، ترقی اور خدمت کسی جماعت کی طرف سے ہو یا افراد کی جانب سے، گلشن کی خوشبوؤں کی طرح ہے، اور اس کی شہرت پھیلانے والے لوگ اُس ہَوا کی طرح ہیں جو باغ و چمن کی خوشبوئیں لے کر اطراف میں پھیل جاتی ہے اور قرب و جوار میں رہنے والوں کے دماغ کو معطّر کر دیتی ہے۔

ایک حقیر سی اگر بتّی کی چھوٹی سی قربانی کتنے آدمیوں کے لئے کافی ہوتی ہے، وہ تو جل جل کر فنا ہو جاتی ہے، مگر اس کی خُوشبو کا احساس اور تاثر بہت سے دماغوں میں باقی رہتا ہے، اس میں یہ درسِ حکمت ہے کہ چیزوں کے فنا ہو جانے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ قطعی طور پر نیست و نابُود ہو جاتی ہیں، بلکہ فنا کے معنی یہ ہیں کہ اس میں چیزیں ایک حالت سے دُوسری حالت میں بدل جاتی ہیں۔

ایسے ہی اشارے موم بتّی کے جل کر روشنی بن جانے میں بھی ہیں، اور اُن میں سے ایک تو یہ ہے کہ جس طرح صرف چند ہی چیزوں کے جل جانے

سے خوشبو مہیا ہوتی ہے یا روشنی پیدا ہوتی ہے اور ہر چیز میں یہ خاصیت نہیں ہے، اسی طرح حقیقی مومنین ہی ہیں جن کی قربانیاں مذہبی اور رُوحانی طور پر مقبول اور مُفید ثابت ہو سکتی ہیں، اور صرف وہی افراد ہیں جو اپنی خودی کو نورانیت میں فنا کر سکتے ہیں، جس طرح موم بتّی خود کو فنا کر کے روشنی بن جاتی ہے۔

سات آسمان اور سات زمین:۔

سوال ۹۳: سات آسمان اور سات زمین کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

جواب: آپ کا یہ سوال قرآنِ پاک کی (۶۵/۱۲) کے تحت ہے، چُنانچہ جاننا چاہیئے کہ رُوحانی اور ظاہری علم کی نئی تحقیق کے مطابق سُورج اِس کائنات کے عظیم گلوب کے عین وسط میں واقع ہے، اور اس کے گرداگرد چودہ فرضی دائرے مقرّرہ ہیں، جو پیاز کے پردوں یا تہوں کی طرح باہر کی جانب بڑے سے بڑے اور اندر کی طرف چھوٹے سے چھوٹے ہیں، جن میں سے باہر کے سات دائرے آسمان اور اندر کے سات دائرے زمین کہلاتے ہیں، اور ان کو کائناتی آسمان اور کائناتی زمین کہنا چاہیئے۔

دُوسرے آسمان و زمین کوکبی ہیں، وہ اس طرح کہ اِس کائنات کے اندر جتنے سیّارے اور ستارے ہیں، وہ مادہ جسم، رُوح اور زندگی کے عُروج و ارتقا کے اعتبار سے کُل چودہ درجوں پر منقسم ہیں، اُن میں سے اُوپر کے سات درجے آسمان اور نچلے سات درجے زمین ہیں۔

علاوہ برآں سات ناطق روحانیت کے سات آسمان ہیں اور ان کے سات اساس سات زمین، اِس مطلب کے لئے تاویل کی کتابیں دیکھو، اور

دُوسرے لحاظ سے سات امام اور ان کے سات حُجّت رُوحانیت کے آسمان و زمین ہیں۔

نیز انفرادی رُوحانیت کے چودہ مراحل ہیں، کہ اُن میں سے شروع کے سات مراحل زمین کی طرح ہیں اور بعد کے سات مراحل آسمان جیسے ہیں۔

علیؑ کا ایمان لانا:۔

سوال ۹۴ : بعض کتابوں میں حضرت علی علیہ السّلام کے ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ کیا نعوذ باللہ، علیؑ شروع شروع میں غیر مُسلم تھے؟ اگر بات کچھ ایسی ہے تو کیا کوئی پیغمبر یا کوئی امام پہلے غیر مُسلم بھی ہو سکتا ہے؟

جواب : آپ کا سوال بڑا اہم اور بہت مُفید ہے کیونکہ اس کے جواب میں ایمان، مرتبۂ نبوّت اور درجۂ امامت کی بُنیادی باتیں آتی ہیں، چُنانچہ جاننا چاہئے کہ ایمان لانے کی مختلف صورتیں ہُوا کرتی ہیں جیسے کسی کافر کا ڈر کے مارے ایمان لانا یا دُنیاوی فائدے کی طمع سے ایمان لانا یا حق بات کو سمجھ کر ایمان لانا، اور ایک ایسے مومن کا ایمان لانا جو پہلے سے ہی مومن تھا، یا یُوں کہنا چاہئے کہ ایمان لانے والوں کے احوال اور درجات ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں، کیونکہ ایمان لانے کے کئی معنی ہیں، جیسے باور کرنا، اقرار کرنا، تصدیق کرنا وغیرہ۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ: جب خُدا نے پیغمبروں سے اقرار لیا کہ ہم تم کو جو کچھ کتاب اور حکمت دیں اس کے بعد تمہارے پاس کوئی رسُول آئے اور جو کتاب تمہارے پاس ہے اس کی تصدیق کرے، تو تُم ضرور اس پر ایمان لانا اور

ضرور اس کی مدد کرنا اور، خُدا نے فرمایا کیا تُم نے اقرار کر لیا؟ اور ان باتوں پر جو ہم نے تم سے اقرار لیا تُم نے میرے (عہد کا) بوجھ اُٹھا لیا؟ سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا (۳/۸۱)۔

اس قرآنی تعلیم سے یہ مطلب صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ خُدا کے حکم سے تمام انبیاء ایک دُوسرے پر ایمان لاتے ہیں، لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ وہ اپنے وقت میں یا اپنی طرف سے دیندار نہیں ہوتے اور ذاتی طور پر دین و ایمان کو حاصل نہیں کر سکتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر آنے والے نبی کو برحق مانتا ہے اور سابق پیغمبر کی تصدیق کرتا ہے، تاکہ اس سے انبیاء کی دعوت کو تقویت ملے اور لوگوں کی صحیح رہنمائی ہو، کیونکہ جاہل لوگ اکثر اس وقت گمراہ ہو جاتے ہیں جبکہ ایک پیغمبر کے بعد دُوسرا پیغمبر آتا ہے۔

سورۂ صف (۶۱) کی آیت ۶ میں مذکورۂ بالا حکمِ خُداوندی کی تعمیل کا ایک عُمدہ نمونہ موجود ہے کہ حضرتِ عیسٰےؑ نے بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہُوا آیا ہوں کہ مُجھ سے جو پہلے توراۃ (آ چکی) ہے میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسُول آنے والے ہیں جن کا نامِ (مُبارک) احمد ہو گا میں ان کی بشارت دینے والا ہوں (۶۱/۶)۔

ایک حقیقی مومن احوالِ انبیا کی روشنی میں ائمۂ طاہرین کی بہت سی حقیقتیں سمجھ سکتا ہے، چُنانچہ یہ حقیقت ہے کہ مولا علیؑ نے جس طرح آنحضرتؐ پر ایمان لایا وہ اعلیٰ سطح پر تھا، یعنی آپؑ نے رسولِ خداؐ کو برحق مانا اور حضور کی نبوت و رسالت کی تصدیق کی، درحالیکہ ملّتِ ابراہیمی کا چراغ حضرتِ ابوطالب امامؑ کے گھر میں روشن تھا۔

جب خُدا تعالیٰ نے اپنے نُور کی تعریف کرتے ہُوئے فرمایا کہ وہ تو نُور

علیٰ نُور ہے یعنی ایک چراغ سے دُوسرے چراغ کو روشن کیا جاتا ہے۔

تو سوال اُٹھتا ہے کہ آنحضرتؐ کی مُبارک شخصیت کے چراغ کو کس قریب ترین چراغ سے روشن کیا گیا؟ ہمارے پاس بس یہی ایک اٹل جواب ہے کہ حضرت ابو طالب علیہ السّلام ہی اپنے زمانے کے امامِ مقیم تھے۔

آپ سورۂ نساء کی آیت ۱۳۶ میں خُوب غور و فکر سے دیکھیں کہ اہلِ اسلام کے ایمان لانے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان جاری ہے کہ :۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا (اے ایمان والو تم ایمان لاؤ) ظاہر ہے کہ یہ ایمان کافروں کے ایمان لانے کی طرح نہیں کہ اس میں انکار کے بعد اقرار ہوتا ہے اور اس کے برعکس یہاں ایمان لانے کے بعد بھی ایمان لانا ہے، اور اس حکم میں اگرچہ لفظ "ایمان" ایک ہی ہے، لیکن جن لوگوں کو ایمان کی ترقی چاہئے وہ تو راہِ مُستقیم کے الگ الگ مراحل میں ہیں، لہٰذا ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی تشریح ایک جیسی نہیں ہوگی، بلکہ اس کی تشریح ایمان کے مختلف درجات کے مطابق ہوگی، کیونکہ لوگ ایمان کے سلسلے میں ایک جیسے نہیں ہو سکتے، جبکہ ایمان صراطِ مُستقیم کے شروع سے لے کر اخیر تک قدم بہ قدم بڑھتا چلا جاتا ہے اور جہاں معرفت درجۂ کمال کو پہنچتی ہے وہاں ایمان بھی اپنے اوجِ کمال پر پہنچتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرتِ مولانا مُرتضےٰ علی علیہ السّلام نے رسُولِ خُداؐ پر جو ایمان لایا وہ نورِ معرفت کی روشنی میں تھا، آپؑ نے آنحضرتؐ کو پیغمبرِ برحقؐ مانا، آپؑ نے حضورؐ کی تائید و تصدیق کی، جس طرح حضرتِ ہارُونؑ نے حضرتِ موسیٰؑ پر ایمان لایا تھا اور ان کی نبوّت و رسالت کی تائید و تصدیق کی تھی، جس کا ذکر اِس موضوع میں قبلاً گزر چکا۔

میّت پر چھانٹا:۔

سوال ۹۵ : (الف) کیا مرجانے کے بعد پھر سے زندہ ہو جانا ہے؟ (ب) کیا بہشت اور دوزخ واقعاً موجود ہیں؟ (ج) جب موکھی صاحب تم کو مرجانے کے بعد چھانٹا دیتے ہیں، اور اگر موکھی کے اس عمل سے تمہارے سب گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، تو پھر تمہیں زندگی میں اچھے اعمال انجام دینے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب : (الف) جی ہاں، مرجانے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جانا ایک قرآنی حقیقت ہے جس پر ایک مُسلم کو ایمان رکھنا چاہیئے۔

(ب) ہاں، بہشت اور دوزخ کا وجود بھی حق ہے اور اس سے انکار کرنے والا کافر ہے۔

(ج) اگر موکھی صاحب بعض جگہوں میں میّت پر چھانٹا ڈالتا ہے، تو یہ ایک عامیانہ عقیدہ اور معمولی سی رسم ہے نہ کہ اصولات کی کوئی بات، اور اگر یہ چیز اصولات میں سے ہوتی تو خُدا اور رسولؐ اور أئمۂ اطہار کے ارشادات میں اس کا کوئی تاکیدی حکم ملتا مگر ایسا نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عقیدہ اور مذہبی رسم میں بھی ایک مصلحت اور حکمت ہے، مگر اس کا فائدہ صرف انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، جو مومن، نکوکار اور پرہیزگار ہیں، اور جو لوگ ان کے سوا ہیں ان کو عقیدہ اور رسم موت کے بعد کوئی نجات نہیں دلا سکتی ہے۔

چھانٹا ہمارے مذہب کا ایک عُمدہ عقیدہ ہے، عقیدت کا خوشگوار اور نتیجہ خیز اثر مومن کی زندگی ہی میں زیادہ سے زیادہ کام کر سکتا ہے، اور مرجانے

کے بعد اس کی کوئی خاص نفسیات نہیں بنتی، یعنی وہ اس عمل سے نہ تو خوابِ غفلت سے جاگ سکتا ہے اور نہ ہی توبہ کر سکتا ہے، جیسا کہ زندگی میں چھانٹے کا یہ مقصد پُورا ہو سکتا تھا، مگر ہاں، اس کا فائدہ صرف اتنا ہی ہے کہ جب بہت سارے مومنین اعتقادی طور پر خیال کرتے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ اس گزشتہ مومن کے حق میں یہ عمل مُفید ہے تو ان کی یہ عقیدت ایک دُعا کی صُورت بن جاتی ہے۔

اہلِ نجات:۔

سَوال ۹۶ : کیا ایک غیر اسماعیلی کے لئے نجات حاصل کرنا اور خُدا تعالیٰ سے واصل ہو جانا ممکن ہے؟ اگر نہیں تو کس وجہ سے دُنیا کے اتنے سارے لوگوں کو چھوڑ کر صرف ایک بہت ہی قلیل تعداد کو نجات کا حق حاصل ہوا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا قانون عدل و انصاف کی خُوبیوں سے بھرپُور ہے؟

جَواب : ہم آپ کو بطریقِ آسان سمجھانے کے لئے اس سوال کے تین حِصّے کرتے ہیں، اور وہ اس طرح سے کہ:

(الف) دینِ اسلام میں نجات کا وسیلہ کیا ہے؟

(ب) انبیأ علیہم السلام کی دعوتِ حق کے نتیجے پر تھوڑے ہی لوگوں کو نجات ملی ہے یا سب لوگوں کو؟

(ج) خُدائی عدل و انصاف کی حقیقت کیا ہے؟

چُنانچہ اِس میں پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ دینِ اسلام میں وسیلۂ نجات آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں، اور حضورؐ کے بعد آپؐ کے اہلِ بیتِ اطہار علیہم السّلام اسی درجہ پر فائز ہیں، اور اہلِ بیت سے أئمۂ ہُدا

مُراد ہیں، جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے کہ: مثل اھلِ بیتی مثل سفینۃ نوحٍ من رکبھا نجا ومن تخلّف عنھا غرق (احادیثِ مثنوی صفحہ ۱۶۶) میرے اہلِ بیت کی مثال سفینۂ نوح کی مانند ہے جو اس میں سوار ہو گیا نجات پا گیا اور جس نے خلاف ورزی کی وہ غرق ہو گیا۔

اب جبکہ وسیلۂ نجات پیغمبرِ اکرمؐ کے بعد حضورِ انورؐ کے اہلِ بیت صلوات اللہ علیہم، ہیں تو ظاہر ہے کہ اطاعت و فرمانبرداری کے نتیجے میں نجات صرف انہی لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو زمانے کے امام کو مانتے ہیں کہ اہلِ بیتِ رسولؐ سے یہی امامِ زمان مُراد ہیں، کیونکہ پیغمبرِ خداؐ کا وہ گھر جو علم و حکمت سے معمُور تھا اب امامِ حیّ و حاضرؑ ہی کی تاویل و ہدایت کی بدولت آباد ہے۔ اِس لئے کہ "اہلِ بیت" کا پُر حکمت کلمہ اپنے اندر جو جو معانی رکھتا ہے، وہ معانی ہیں کہ آنحضرتؐ کے رُوحانی اور نورانی اقربا، علم و حکمت اور رُشد و ہدایت میں آپؐ کے نمائندے، جانشین اور اولوالامر ہیں، جن کی اطاعت خُدا اور رسولؐ کی اطاعت کے بعد فرض ہے۔

دُوسرا سوال ہے کہ آیا انبیاؑ علیہم السّلام کی دعوتِ حق کے نتیجے پر تھوڑے ہی لوگوں کو نجات مِلی ہے یا سب کو؟ اس کا جواب ظاہر اور صاف ہے کہ دعوتِ انبیاءؑ کے نتیجے پر تھوڑے ہی لوگوں کو نجات ملی ہے اور بہت سے لوگ دعوتِ حق قبول نہ کرنے کی وجہ سے وسیلۂ نجات سے محروم ہو گئے ہیں، جس کا مفصّل حال قرآنِ حکیم میں مذکور ہے۔ اب اس سے اصل سوال کا جواب سمجھنا آسان ہو گیا کہ ہر زمانے میں اہلِ نجات صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو زمانے میں ہادئ برحق کی اطاعت کرتے ہیں۔

تیسرا اور آخری سوال تھا کہ خدا کے عدل و انصاف کی حقیقت کیا ہے؟ اس

کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون اوّل میں بھی اور آخر میں بھی عدل و انصاف کی خوبیوں سے پُر ہے، کہ خدا نے اپنے اِس قانون کے مطابق کسی بھی زمانے میں دُنیا کو نورِ ہدایت سے خالی نہیں رکھا، اِس کے یہ معنی ہُوئے کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا والوں کو نہ تو دورِ نبوّت میں ہدایت سے محروم رکھا اور نہ ہی زمانۂ امامت میں، سو جنہوں نے ہدایت کے اِس سرچشمے کو پہچان لیا، تو ان کو سفینۂ ہدایت میں جگہ ملی اور وہ اہلِ نجات میں سے ہو گئے اور جو لوگ ہادئ برحق سے منکر ہُوئے وہ کشتئ نجات سے محروم ہو کر طوفانِ ضلالت میں ڈوب گئے اور ہلاک ہو گئے۔

جب اسلام دینِ فطرت ہے تو اس میں جو کچھ بھی واقع ہو گا وہ ہمیشہ قانونِ فطرت کے عین مطابق ہو گا، اور وہ یہ ہے کہ اس دُنیا میں جو چیز اعلیٰ و ارفع ہے وہ تعداد اور مقدار میں کم ہُوا کرتی ہے، اور اس کے برعکس جو چیز ادنیٰ و پست ہے وہ بہت زیادہ ہوتی ہے، جس کی مثال قانونِ قدرت کے ہر مقام پر مل سکتی ہے، چنانچہ آپ مخلوقات میں سے جمادات، نباتات، حیوانات اور اِنسانوں کی ترکیب و ترتیب میں غور کریں، کہ کس طرح جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات اور اخیر میں انسان بنتے ہیں، اور اس جسمانی تخلیق کے سلسلے میں دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ چیزیں نیچے سے نیچے زیادہ اور اُوپر سے اُوپر کم ہوتی چلی جاتی ہیں، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ اگر دُنیا میں اہلِ نجات دُوسروں کے مقابلے میں بہت ہی کم تعداد میں ہیں تو یہ قانونِ قدرت کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہے۔

مخلوقات میں عُروج وارتقا کی دُوسری مثال یہ ہے کہ اگر کھیت میں یا باغ میں گھاس اُگائی جاتی ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زمین کی ساری مٹی گھاس بن جاتے، اِسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ گائے جتنی گھاس کھاتی ہے اُتنا دُودھ پیدا

ہو، یہ بھی انصاف سے دُور ہے کہ سارا دُودھ آدمی ہی اُٹھا لے اور بیچارے بچھڑے کو کچھ بھی نہ چھوڑے، پھر سب دُودھ کی ملائی کب بنتی ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ ملائی سے مکھن کم ہوتا ہے، سب جانتے ہیں کہ مکھن کے صاف تیل بنانے سے اس میں اور بھی کمی واقع ہوتی ہے، جب تیل میں کھانے کی کوئی چیز بھون لی جاتی ہے تو تیل کا ایک اور حصہ جل جاتا ہے یا کہ اُڑ جاتا ہے، جس وقت انسان تیل میں بھنی ہُوئی غذا کھا لیتا ہے تو اُس تیل میں سے تھوڑی سی انرجی (ENERGY) بنتی ہے اور اس میں سے بہت تھوڑی انرجی مُفید ثابت ہوسکتی ہے، یہی قانونِ فطرت ہے اور دین کی بھی یہی مثال ہے کہ عقائد و نظریات اور علم و ہدایت میں لوگوں کی رسائی کے مطابق درجات مقرر ہیں اور ان درجات میں اُوپر سے اُوپر لوگوں کی تعداد کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

عورت اور امامت :۔

سوال ۹۷: کوئی عورت کیوں امام نہیں بن سکتی ہے؟

جواب: یہ مسئلہ "سو سوال" کے سلسلے میں دو دفعہ ہمارے سامنے آیا ہے، چونکہ یہ سوال بڑا دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے، لہٰذا ہم اس کے جواب کو بھی دو دفعہ لکھتے ہیں۔

کسی عزیز نے نہ معلوم سوچ سمجھ کر یا اتفاقاً بڑی عجیب منطق سے یہ سوال کیا ہے، کیونکہ ہر دانشمند کے نزدیک ان دونوں سوالوں میں بہت کچھ فرق ہے، ایک یہ سوال کہ "کوئی عورت کیوں امام نہیں بن سکتی ہے؟" جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خاص و عام سب عورتوں میں سے کسی ایک کو بھی امامت کیوں نہیں ملتی ہے؟ اور کیوں یہ ہمیشہ مَردوں ہی کو ملا کرتی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ہر مرد کے لئے

یہ ممکن ہے کہ وہ امام ہو، جبکہ ان کے مقابلے میں سب عورتیں اِس رتبۂ عالیہ سے محروم ہیں، حالانکہ یہ سوال اِس طرح دُرست نہیں۔

دُوسرا سوال ہے کہ "کبھی کسی امام کی کوئی بیٹی کیوں امام نہیں بن سکتی ہے"؟ یا یُوں کہنا چاہیئے کہ: خاندانِ امامت کی کسی عورت کو کیوں امامت نہیں مل سکتی ہے؟ یہ سوال اس طرح سے اِس لئے ہونا چاہیئے کہ امامت کا منصبِ عالی ایسا نہیں کہ کوئی بھی اس کو حاصل کر سکے، بلکہ وہ ایک مخصوص خاندان میں ہے، اور وہ خاندانِ رسُولؐ ہی ہے۔

چُنانچہ اَب ہم یہاں مذکورہ دو قسم کے سوالوں میں سے دُوسرے کے جواب کو لکھ دیتے ہیں کہ:

(الف) قانُونِ قرآنی کے مطابق باپ کی چھوڑی ہُوئی میراث میں سے بیٹے کو دو حصّے ہیں اور بیٹی کو ایک حصّہ، اس سے ظاہر ہے کہ عورت سے مرد افضل ہے، لہٰذا امام کا بیٹا ہی تختِ امامت کا وارث ہُوا کرتا ہے نہ کہ امام کی بیٹی۔

(ب) شانِ امامت کے برحق ہونے کے ثبوت میں یہ بھی اللہ تعالےٰ کا ایک زبردست معجزہ ہے اور سورۂ کوثر کے علاوہ بہت سی قرآنی آیات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ائمۂ آلِ محمدؐ کے ہاں مسندِ امامت کے وارث بن جانے کے لئے ہمیشہ بیٹے کا پیدا ہونا قدُرتی امر ہے، اور یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ امامِ برحقؑ کی نرینہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے لڑکی کو امامت دے دی جائے۔

(ج) قانُونِ امامت بہت سی باتوں میں قانُونِ نبوّت ہی کی طرح ہے، چُنانچہ جب خواتین میں سے کوئی خاتُون پیغمبر نہیں ہُوئی ہے، تو کوئی امام زادی امام نہیں ہوسکتی ہے۔

(د) اسلام دینِ فطرت ہے، اور قانُونِ فطرت کی رُو سے مرد کے مقابلے میں

عورت کئی اعتبارات سے کمزور اور مجبور ہے، مثلاً ماہواری، حمل، زچگی وغیرہ، یہ حالات ایسے ہیں کہ ان میں عورت کا دائرۂ کار بہت ہی محدود ہو جاتا ہے لہٰذا عورت جسمانی طور پر منصبِ امامت پر فائز نہیں ہو سکتی ہے۔

(ہ) جب عورتوں کی ایک جماعت ہوتی ہے، اور ان کو شرعی نماز پڑھانے کے لئے کوئی مرد نہیں ہوتا تو شریعت کا حکم ہے کہ ایک قابل عورت ایسی حالت میں اُن سب عورتوں کی امامت کرے کہ وہ اگلی صف میں رہے اور کسی مرد پیش نماز کی طرح سب سے الگ ہو کر آگے نہ ہو جائے، جس کا تاویلی اشارہ یہ ہے کہ خاندانِ نبوّت و امامت کی بیٹیاں اگرچہ مرتبۂ ظاہر میں نبوّت و امامت کی وارث نہیں بن سکتی ہیں تاہم باطن میں نُورِ ہدایت کے مرکز سے مل کر رہیں۔

(و) مَردوں اور عورتوں میں سے جتنے امام کے مرید ہیں وہ سب امامِ عالی مقام کی بیٹیوں کی طرح ہیں، کیونکہ ان کو میراثِ دین کا صرف ایک حصّہ مقرّر ہے اور وہ باطن میں امامِ برحق کے نُور تک رسا ہو جاتا ہے، جبکہ مرید امامِ زمان کی صرف رُوحانی اولاد ہیں، مگر امامِ وقت کا جو فرزند جانشین ہونے والا ہے وہ ہر اعتبار سے امامِ عصر کا بیٹا ہے، اِس لئے اس کو دین کی میراث کے دو حصّے مقرّر ہیں کہ وہ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی امام کے نور کا وارث ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ رُوحانی اور جسمانی دونوں صورتوں میں امامِ برحق کا فرزند ہے، سو یہی وجہ ہے کہ عورت کی امامت شرعی نماز میں صف ہی کے اندر پوشیدہ اور محدود ہوتی ہے اور مرد کی امامت کی طرح آگے نکل کر نمایاں نہیں ہوتی، اور یہ صُورتِ حال نُورِ امامت کے مرتبۂ باطن کی دلیل ہے، جس کو رُوحانی طور پر امام کے سب مُرید اپنی اپنی قابلیت کے مطابق حاصل کر سکتے ہیں۔

(ز) سورۂ نساء کی آیت ۳۴ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: مرد حاکم ہیں عورتوں

پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے (۴/۳۴) اِس قرآنی اصول سے یہ حقیقت روشن ہے کہ عورت کا ظاہر میں امام بن جانا محال ہے، کیونکہ امام کو حاکم اور افضل ہونا ہے نہ کہ محکوم اور مفضول۔

امام کی شادی:۔

سَوال ۹۸: کیا یہ بات دُرست ہے جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ امامِ برحق کسی اسماعیلی لڑکی سے اِس لئے شادی نہیں کرتے ہیں کہ مریدی کی لڑکیاں آپ کی رُوحانی بیٹیوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور کسی رہنما کو اپنی رُوحانی بیٹی سے شادی نہیں کرنی چاہیئے؟

جَواب: یہ بات قطعاً غلط ہے اور اس کو حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، جو مانا جائے کہ امام علیہ السّلام کو اسماعیلی لڑکی سے نکاح جائز نہیں، اگر کوئی شخص اِس مسئلے کو مکمّل وضاحت کے ساتھ جاننا چاہتا ہے تو وہ اسماعیلی فقہ کی کتاب "دعائم الاسلامؒ" کے بابِ نکاح کو دیکھے، نیز سُنّتِ رسُولِ مقبولؐ اور ائمۂ طاہرینؑ کے مجموعی کردار پر نظر ڈالے تاکہ اِس مُعاملے سے متعلق بُنیادی باتوں کا عِلم ہو سکے۔

یہاں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اِسلام میں نکاح اور حلال کا ایک دائرہ مقرّر ہے، اور اس میں اُن تمام عورتوں کا ذکر ہے کہ جن میں سے کسی ایک کو نکاح کے لئے کوئی مُسلمان منتخب کر سکتا ہے، اَب اگر ایک شخص اپنی صوابدید اور مصلحت کے مطابق دائرۂ حلال کی کِسی عورت سے نکاح کرتا ہے، تو کوئی آدمی کس طرح یہ نظریہ قائم کر سکتا ہے کہ جس نے جو کچھ نکاح کیا بس اس کے لئے

یہی کچھ حلال تھا؟

چُنانچہ اگر امام برحقؑ بعض دفعہ اسماعیلی خاندانوں کو چھوڑ کر کسی اور خاندان کی لڑکی سے شادی کرتے ہیں، تو یہ امامِ عالیمقام کی حکیمانہ مرضی اُس دائرۂ اختیار و انتخاب کے اندر ہے جو قانونِ اسلام نے مقرّر کر دیا ہے، جس کا اُوپر ذکر ہُوا۔

نہ معلوم یہ غلط بات کہاں سے پیدا ہُوئی ہے کہ "امام اپنے مریدوں کی کسی لڑکی سے نکاح نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ تو امام کی رُوحانی بیٹی کی حیثیت سے ہے"۔ حالانکہ کسی پیغمبر، امام، پیر اور مُرشد کے لئے ایسا نکاح کبھی ممنوع نہیں ہُوا ہے، کیونکہ وہ رشتہ رُوحانی ہے اور یہ نکاح جسمانی، چونکہ رُوحانیت الگ ہے اور جسمانیت الگ۔

سوائے حضرتِ نوحؑ اور حضرتِ لوطؑ کی بیویوں کے باقی تمام انبیاء کی بیویاں مُسلمان دیندار اور اپنے اپنے شوہر کی رُوحانی بیٹیوں کی حیثیت سے تھیں، اور جملہ أئمہ کی بیویاں بھی اِسی حیثیت سے ہُوا کرتی ہیں، یہی مثال حضرتِ مولانا شاہ کریم الحسینی حاضر امام کی اہلیۂ محترمہ کی بھی ہے۔

مزید وضاحت کی جاتی ہے کہ جس شادی کا یہاں ذکر ہو رہا ہے وہ جسمانی شادی ہے اور جن معنوں میں اسماعیلی لڑکیاں امام کی بیٹیاں قرار پاتی ہیں وہ تو رُوح اور رُوحانیت کی باتیں ہیں، پھر کس طرح جسمانی نکاح اور شادی رُوحانی بیٹی سے ناجائز اور ممنوع ہو سکتی ہے، جبکہ ہر حالت میں امام کی اہلیہ خود بخود رُوحانی بیٹی بن جاتی ہے، اور جبکہ ہم سب کی بیویاں ہماری رُوحانی بہنیں ہوتی ہیں۔

کچھ لوگوں نے غلطی سے یہ سوچا ہو گا کہ جب امام کسی غیر اسماعیلی خاندان کی لڑکی سے شادی کرتے ہیں، تو اس کا مقصد یہ ہے کہ امامِ اقدس و اطہر کی بیگم صاحبہ غیر اسماعیلی ہی رہیں، مگر یہ خیال صریحاً غلطی پر مبنی ہے، کیونکہ امامِ عالی وقار

کی بیگم شادی سے پہلے یا بعد میں اسماعیلیت کو قبول کرلیتی ہے اور خود بخود امامِ برحق صلوات اللہ علیہ کی روحانی بیٹی قرار پاتی ہے، اور حق بات یہ ہے کہ حضرت بیگم سلیمہ صاحبہ کے بارے میں یہی عقیدہ رکھا جائے، کیونکہ آپ نظریۂ اسماعیلیت کے مطابق امامِ زمانؑ کے خاندانِ نُورانیت میں سے ہیں۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مولانا مُرتضٰے علی علیہ السّلام سے فرمایا کہ :"اے علی مَیں اور تم مومنین (ومومنات) کے ماں باپ ہیں"۔ رسُولِ برحقؐ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کی قابلِ قدر ازواج آنحضرتؐ کی رُوحانی بیٹیوں میں سے تھیں اور حضرتِ فاطمۃ زہراؑ بھی مولا علیؑ مشکل کُشا کے لئے رُوحانیت میں اسی حیثیت سے تھیں، اسی طرح ہر زمانے کے امامِ اور باب یعنی حجّتِ اعظم تمام مومنین ومومنات کے ماں باپ کا درجہ رکھتے ہیں، اور یہ صرف رُوحانی اعتبار سے ہے نہ کہ جسمانی لحاظ سے۔

اِس بیان سے یہ حقیقت کُلّی طور پر روشن ہوگئی کہ جب کبھی امام کسی غیر اسماعیلی خاندان کی لڑکی سے شادی کرتے ہیں تو اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ کِسی مُرید کی لڑکی سے شرعاً نکاح نہیں کرسکتے، بلکہ امامِ عالی وقار کے اِس پُرحکمت کام میں مُریدوں کے علاوہ عالمِ اسلام اور دُنیائے انسانیت کے لئے بھی بہت سی مفید مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جن کو اہلِ دانش کے بغیر کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے، اور ان کی وضاحت اِس جواب میں ضروری نہیں ہے۔

قربانی:-

سوال ۹۹ : قرآن میں حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام کے کِس

فرزند کی قربانی کا قِصّہ ہے؟ حضرتِ اسماعیلؑ کا یا حضرتِ اسحاقؑ کا؟ نیز یہ بتائیں کہ اس میں تاویلی حکمت کیا ہے؟

جواب : قرآنِ پاک (۳۷/۹۹-۱۰۷) میں حضرتِ اسماعیل علیہ السّلام کی قربانی کا ذکر فرمایا گیا ہے، یہ قرآن کی تنزیل کی بات ہے مگر قربانی کی تاویل میں جناب اسماعیلؑ اور جناب اسحاقؑ دونوں اس عظیم امتحان میں شامل ہیں، اس کی وضاحت ذیل کی طرح ہے:۔

(الف) اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیم خلیلؑ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے فرزندِ جگر بند حضرتِ اسماعیلؑ کو راہِ خُدا میں ذبح کر دیں اور اس فرمانِ خُداوندی کی بجا آوری کے لئے عظیم باپ بیٹے نے برضا و رغبت تیاری کی اور حضرتِ اسماعیلؑ کے مبارک گلے پر والد بزرگوار کی تیز چُھری پھرنے لگی، لیکن پروردگارِ عالم نے اس بیمثال جسمانی قربانی کو رُوحانی قربانی کی صورت میں بدل دیا۔

(ب) ارشادِ خُداوندی ہے کہ: وَفَدَیۡنٰہُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ (۳۷/۱۰۷) اور ہم نے اس کے بدلے میں ایک عظیم قُربانی دی۔ یعنی اس کی شخصیت کی قربانی روحانی قربانی کی شکل میں بدل گئی، کیونکہ "ذبحِ عظیم" کا مطلب رُوحانی قربانی ہے جو جسمانی قربانی سے بہت بڑی ہے، اور رُوحانی قربانی کے مختصر معنی یہ ہیں کہ حضرتِ اسماعیل علیہ السّلام سے مرتبۂ امامت کا عہد لیا گیا، اور اس کی وضاحت یہ ہے جناب اسماعیلؑ کو طرح طرح کی سخت رُوحانی آزمائشوں سے گُزرنا پڑا اور انہوں نے رُوحانیت کی تمام منزلوں میں ایک ایک قربانی پیش کی، تاکہ کارِ امامت میں صبر کے معنی ہر لحاظ سے دُرست ہوں، جیسا کہ ارشادِ قرآنی ہے: اور ہم نے ان میں سے ائمّہ بنائے جو ہمارے امر کے مطابق ہدایت کیا کرتے تھے جبکہ وہ صبر میں کامل تھے (۳۲/۲۴)۔

(ج) کہا جاتا ہے کہ حضرتِ اسماعیلؑ کے بدلے میں جس دُنبے کو ذبح کیا گیا تھا، وہی دُنبہ "ذبحِ عظیم" ہے، لیکن عقل و دانش کے نزدیک حضرتِ اسماعیلؑ سے دُنبہ کس طرح عظیم ہو سکتا ہے، لہٰذا ذبحِ عظیم سے رُوحانی قُربانی مراد ہے، جو حضرتِ اسماعیلؑ کے علاوہ حضرتِ اسحاقؑ نے بھی پیش کی کہ دونوں حضرات علی الترتیب امامِ مستقر اور امامِ مستودع تھے، اور ہر امام خواہ وہ مستقر ہو یا مستودع اس عظیم رُوحانی قربانی کے بعد ہی درجۂ امامت پر فائز ہو جاتا ہے۔

(د) حضرتِ اسماعیلؑ کی شخصیت کی قربانی سے اُن کی رُوحانیت کی قربانی اس لئے انتہائی عظیم ہے کہ آپؑ کی نسلِ پاک سے سرورِ انبیاء حضرتِ مُحمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پیدا ہوئے، اور آنحضرتؐ کی ظاہری و باطنی قربانیوں کی برکت سے دینِ اسلام ظاہر اور قائم ہُوا۔

(ہ) اگر اسماعیلؑ کی قربانی صرف شخصیت ہی میں محدود ہوتی یعنی اگر ان کو اسی وقت ذبح کیا جاتا جبکہ وہ اس کے لئے تیار تھے تو وہ لاتعداد رُوحانی قربانیاں نہ ہوتیں جو آپؑ نے اس کے بعد زندہ رہ کر پیش کیں اور آپؑ کے سلسلے میں اُئمۂ برحق نے انجام دیں اور امامت کے ساتھ ساتھ قیامت تک یہ قربانیاں جاری ہیں، لہٰذا خداوند تعالیٰ نے جسمانی قُربانی کو رُوحانی قربانی کی صورت میں تبدیل کرتے ہوئے عظیم باپ بیٹے پر نہ صرف احسان ہی کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان کے ثواب میں بھی بدرجۂ انتہا اضافہ کر دیا۔ پس انہی معنوں میں رُوحانی قربانی کا نام ذبحِ عظیم ہے۔

(و) یاد رہے کہ عوام کے لئے جسمانی قربانی یعنی شہادت بہت بڑی چیز ہے کیونکہ وہ رُوحانی قربانی کو نہیں پہنچ سکتے ہیں، جو انبیاء، اُئمّہ اور اعلیٰ درجے کے حقیقی مومنین کے لئے مخصوص ہے، اور خواص کے نزدیک رُوحانی قربانی

انتہائی عظیم ہے۔

(ز) قرب سے قربان اور قربان سے قربانی کا لفظ ہے، جس سے کوئی ایسا وسیلہ مُراد ہے کہ وہ انسان کو خُدا کے قریب کر دے، چُنانچہ ہادیٔ برحق کی ظاہری و باطنی ہدایت سب سے عظیم قُربانی ہے کہ جس سے بندگانِ خُدا اپنے ربّ کے نزدیک ہو جاتے ہیں۔

(ح) "وجہِ دین" جو پیر ناصرِ خسرو کی شہرۂ آفاق تاویلی کتاب ہے، اس میں جہاں جہاں ذبح اور قربانی کا ذکر آیا ہے، وہاں خُوب غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ان دونوں لفظوں کی تاویل کیا ہے اور کس طرح ناطق کی قربانی اساس ہے؟ کن معنوں میں اساس کی قربانی امام ہے؟ کس حیثیت میں امام کی قُربانی حُجّت ہے؟ اور کس صُورت میں حُجّت کی قربانی داعی ہے؟

(ط) جاننا چاہیئے کہ ہر ناطق اپنے خاندان کے ایک قریبی فرد سے اساس ہونے کا عہد لیتا ہے اور یہ عہد تاویلی اعتبار سے قربانی کے کسی جانور کو ذبح کرنے کی طرح ہے، اور اس کو اپنا جانشین مقرّر کرتا ہے تاکہ وہ اُمت کے مومنین کو خُدا سے قریب تر کر دے، اِسی طرح اساس اپنے وارث سے امامت کا عہد لے کر اپنے بعد قربِ الٰہی کا ذریعہ بنا دیتا ہے، امام حجّت کی قربانی پیش کرتا ہے یعنی اس سے عہد لے کر اور رُوحانی دولت سے مالا مال کر کے علم و حکمت کا سرچشمہ قرار دیتا ہے تاکہ وہ بندگانِ حق کے لئے ذریعۂ معرفت ہو، اور اسی طرح حُجّت اپنے درجے کے مطابق داعی کی قُربانی پیش کرتا ہے، یہ ہیں حدودِ دین کی قربانیاں کہ ہر درجے کی قربانی حدود میں سے وہ حد ہے جو اس کے نیچے ہے۔

(ی) حضرتِ اسماعیل کے قِصۂ قربانی میں یہ حکمت بھی ہے، کہ اگرچہ رُوحانی قربانی ہی ہر اعتبار سے افضل و اعلیٰ ہے، لیکن مادی قربانیوں کے بغیر یہ امر محال ہے

کہ کوئی شخص رُوحانیت کی عظیم قربانی کے درجے پر فائز ہو سکے، چُنانچہ ہر دانشمند مومن عظیم رُوحانی قربانیوں سے پہلے اپنے آپ میں ظاہری اور مادّی قربانیوں کی عادت ڈالتا ہے، تاکہ وہ اِس وسیلے سے سب سے عظیم قربانی دینے کے قابل ہو سکے۔

امامؑ اور قربانی :۔

سَوال ۱۰۰ : آپ نے ایک سوال کے جواب میں امام کی قُربانی کا ذکر کیا ہے، لیکن امام پر کس طرح قربانی کا اطلاق ہو سکتا ہے جبکہ وہ خُدا کے نوُر کا مظہر ہے؟ کیا نوُر اِس قربانی سے بے نیاز نہیں ہے؟ کیا نوُر میں ترقی اور اضافے کی گنجائش ہے؟

جَوابْ : (الف) جاننا چاہئے کہ امام اور امامت میں دو چیزیں خاص ہیں وہ شخصیّت اور نور ہیں، اَب اچھی طرح سے سمجھ لو کہ شخصیّت کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہر اور دوسرا باطن اور اسی طرح نور کے بعد بھی دو پہلو ہیں: ایک وہ جس کا تعلق ازل کے ساتھ ہے دوسرا وہ جس کا لگاؤ شخصیّت کے باطن سے ہے، چُنانچہ قربانی کے حقیقی معنوں کا اطلاق امام کی شخصیّت کے ظاہر و باطن پر ہوتا رہتا ہے، ہر چند کہ ایک اعتبار سے نور پر قربانی کا اطلاق نہیں ہوتا، لیکن دُوسرے اعتبار سے نور کی بھی قربانی ہوتی رہتی ہے۔

(ب) ہمارے سامنے انبیاء و ائمّہ علیہم الصلاۃ والسّلام کی جسمانی قربانیوں کی کئی مثالیں موجُود ہیں، جن کی دلیل سے ہم یقین کر سکتے ہیں کہ ہر پیغمبر اور ہر امام کی مبارک ہستی ظاہری و باطنی قربانیوں کا سرچشمہ ہُوا کرتی ہے۔

(ج) سیّدِ شہدا حضرتِ امام حسین علیہ السّلام نے اعلائے حق و حقیقت

کی خاطر اپنی مُقدّس شخصیّت کی قربانی پیش کر دی، اس سے دو حقیقتیں کُھل کر ہمارے سامنے روشن ہو جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ حضرتِ اسماعیلؑ کی قربانی کچھ دکھاوے کے لئے نہیں تھی بلکہ ممکن تھا کہ وہ قطعی طور پر ذبح ہو جاتے، اور دُوسری حقیقت یہ کہ امام اپنی شخصیّت کے ظاہری و باطنی پہلو کے اعتبار سے قربانیوں سے بے نیاز نہیں، مگر ہاں نور کے لحاظ سے وہ اِس سے بے نیاز ہے۔

(د) نور کا ازلی پہلو فعّال نہیں خاموش ہے مگر نُور کا جو پہلو انسانِ کامل کے باطن سے متعلق ہے، وہی کُلّی طور پر حرکت میں ہے، جس طرح ایک روشن چراغ کا اُبھرتا ہُوا شعلہ متحرک اور فعّال ہوتا ہے جو مسلسل روشنی پر روشنی بکھیرتا رہتا ہے، مگر وہ روشنی جو مکان کی صاف و شفاف دیواروں پر نظر آتی ہے خاموش اور ساکن ہے، اس مثال میں چراغ کا ضوفشان شعلہ نور کے متحرک پہلو کی ترجمانی کرتا ہے جو ہادئ زمان کی روحانیت میں ہے، اور دیوار کی سطح پر جو روشنی خاموش ہے وہ نور کے غیر متحرک پہلو کو ظاہر کرتا ہے جو ازل کی طرف ہے۔

(ہ) ازل کا واضح اور روشن تصوّر بھی امامِ وقت ہی کے نور کی روشنی میں ممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے یہاں امام کے نورِ فعّال کی مثال چراغ کے شعلے سے دی ہے اور اس کے ازلی نُور کی مثال دیوار کی ساکن روشنی سے دی ہے۔

(و) ہم نے کہا تھا کہ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو نور کی بھی قُربانی ہوتی رہتی ہے اور حق بات تو یہ ہے کہ نور کی قربانیاں سب سے عظیم ہیں سورج کے بارے میں خُوب غور کرو، کب سے موجود ہے؟ اور کب تک قائم رہے گا؟ اور اندازہ کرو کہ مادّی نور کا یہ سرچشمہ ہر لحظہ کسی سُرعت سے اس کائنات کی بے پناہ وسعتوں کو اپنی تازہ ترین روشنی سے بھر دیتا ہے، یہ مادّی

نُور کی قربانیوں کی مثال ہے اور رُوحانی نور کی قربانیاں اِس سے کہیں زیادہ ہیں۔

(ختم شُد)

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

انڈیکس

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

قرآنی آیات

ISW
LS
Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سورۂ بقرہ

نمبر شمار	حوالۂ آیت	نمبر سوال	مضمون	صفحہ نمبر
۱	۳۰:۲	۹۱	تصورِامامت	۱۷۳
۲	۹۱:۲	۸۰	ولایتِ علی	۱۵۲
۳	۱۲۴:۲	۹۱	تصورِ امامت	۱۷۳
۴	۱۲۸_۱۲۷:۲	۴۴	اسمِ اعظم اور نبوت	۸۳
۵	۱۵۱_۱۵۰:۲	۱۰	حاضرامام کادرجہ	۲۴_۲۳
۶	۱۵۱_۱۵۰:۲	۹۱	تصورِامامت	۱۷۵
۷	۱۵۷:۲	۱۳	صلوات	۳۰
۸	۱۵۸:۲	۳۹	تصویر	۷۵
۹	۱۸۵:۲	۳۵	ترمیم وتجدید	۷۰
۱۰	۱۹۶:۲	۶	سورۂ یاسین	۱۶
۱۱	۲۱۳:۲	۷۷	الکتاب	۱۴۵
۱۲	۲۵۵:۲	۸۹	آدابِ دعا	۱۷۱
۱۳	۲۸۵:۲	۸۴	سلیمان پیغمبر	۱۵۹
۱۴	۲۸۶:۲	۴۸	اختیاراورمقدر	۸۹

سورۂ آلِ عمران

نمبر شمار	حوالۂ آیت	نمبر سوال	مضمون	صفحہ نمبر
۱۵	۳۱:۳	۸۰	ولایتِ علی	۱۵۰،۱۴۹
۱۶	۳۳:۳	۸۳	حضرتِ عمرانؑ	۱۵۶
۱۷	۳۳:۳	۹۱	تصورِامامت	۱۷۳
۱۸	۴۸:۳	۸۵	کتبِ سماوی	۱۶۳
۱۹	۵۹:۳	۸۸	یوسف کا کرتا	۱۶۸

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

نمبر شمار	حوالۂ آیت	باب نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
۲۰	۸۱:۳	۹۴	علی کا ایمان لانا	۱۷۹
۲۱	۸۳:۳	۶۶	دنیا میں تکلیف کیوں	۱۲۰
۲۲	۱۰۳:۳	۳۱	وارثِ رسول	۶۵
۲۳	۱۶۹:۳	۲۵	حضرتِ عیسیٰؑ	۴۷

سورۂ نسآء

نمبر شمار	حوالۂ آیت	باب نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
۲۴	۳۴:۴	۹۷	عورت اور امامت	۱۸۸_۱۸۷
۲۵	۵۴:۴	۳۱	وارثِ رسول	۶۵
۲۶	۵۴:۴	۴۳	کتابِ ناطق اور کتابِ صامت	۸۲
۲۷	۵۴:۴	۴۴	اسمِ اعظم اور نبوت	۸۳
۲۸	۵۴:۴	۸۰	ولایتِ علی	۱۵۲
۲۹	۵۹:۴	۳۱	وارثِ رسول	۶۵
۳۰	۵۹:۴	۸۰	ولایتِ علی	۱۵۰
۳۱	۵۹:۴	۹۱	تصورِ امامت	۱۷۵
۳۲	۱۱۶:۴	۷۸	سب سے بڑا گناہ	۱۴۶
۳۳	۱۳۶:۴	۹۴	علی کا ایمان لانا	۱۸۰
۳۴	۱۷۱:۴	۱۶	نور کہاں سے آیا	۳۵

سورۂ مائدہ

نمبر شمار	حوالۂ آیت	باب نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
۳۵	۲:۵	۳۹	تصویر	۷۵
۳۶	۱۵:۵	۶۳	نورِ واحد	۱۱۲
۳۷	۱۵:۵	۹۱	تصورِ امامت	۱۷۵
۳۸	۳۲_۲۷:۵	۹۱	تصورِ امامت	۱۷۴

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

نمبر شمار	حوالۂ آیت	سوال نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
۳۹	۳۱:۵	۸۵	کتبِ سماوی	۱۶۱
۴۰	۴۴:۵	۸۵	کتبِ سماوی	۱۶۲
۴۱	۵۵:۵	۸۰	ولایتِ علی	۱۵۰
۴۲	۷۸:۵	۸۵	کتبِ سماوی	۱۶۲
سورۂ انعام				
۴۳	۹:۶	۷۹	فرشتے	۱۴۸
۴۴	۷۹ـ۷۶:۶	۳۸	توحید	۷۴
سورۂ اعراف				
۴۵	۳۱:۷	۷۶	حقیقتِ معراج	۱۴۴
۴۶	۵۴:۷	۱۶	نور کہاں سے آیا	۳۴
۴۷	۱۷۹:۷	۲۱	بہشت اور دوزخ	۴۱
سورۂ توبہ				
۴۸	۳۲:۹	۳۲	امام اسماعیل	۶۷
۴۹	۹۹:۹	۱۳	صلوات	۳۰
۵۰	۱۰۳:۹	۱۳	صلوات	۳۰
۵۱	۱۱۱:۹	۵۷	نا ندی کی حکمت	۱۰۷
سورۂ ھُود				
۵۲	۱۰۷:۱۱	۱	علم کا خاتمہ	۹
سورۂ رعد				
۵۳	۸:۱۳	۱	علم کا خاتمہ	۹

ISWLS
Institute for Spiritual Wisdom Luminous Science
Knowledge for a united humanity

نمبر شمار	حوالۂ آیت	سوال نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
سورۂ ابراھیم				
۵۴	۱۴:۲۴_۲۵	۳۱	وارثِ رسول	۶۵
سورۂ حجر				
۵۵	۱۵:۲۹	۱۶	نور کہاں سے آیا	۳۵
۵۶	۱۵:۲۹	۸۶	امام کا دیدار	۱۶۵
۵۷	۱۵:۷۹	۷۲	امام کے معنی	۱۲۷
سورۂ نحل				
۵۸	۱۶:۲۱	۲۵	حضرتِ عیسیٰ	۴۷
۵۹	۱۶:۵۰	۷۹	فرشتے	۱۴۸
۶۰	۱۶:۷۰	۱	علم کا خاتمہ	۸
۶۱	۱۶:۸۱	۴۲	تبدُّلِ اجسام	۸۱
۶۲	۱۶:۱۲۰	۸۰	ولایتِ علی	۱۵۲
سورۂ بنی اسرائیل				
۶۳	۱۷:۱	۷۶	حقیقتِ معراج	۱۴۴
۶۴	۱۷:۳	۴۲	تبدُّلِ اجسام	۷۹
۶۵	۱۷:۷۲	۶۹	مقامِ معرفت	۱۲۴
۶۶	۱۷:۸۵	۱۶	نور کہاں سے آیا	۳۴_۳۵
۶۷	۱۷:۹۵	۷۹	فرشتے	۱۴۸
سورۂ کہف				
۶۸	۱۸:۵۱	۸۹	آدابِ دعا	۱۷۰

ISW
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

نمبر شمار	حوالہ آیت	سوال نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
سورۂ طٰہٰ				
۶۹	۲۰_۱۹:۲۰	۷۹	فرشتے	۱۴۸
سورۂ انبیآء				
۷۰	۳۴:۲۱	۲۸	حضرتِ خضر	۶۱
۷۱	۱۰۷:۲۱	۴۹	صلوات	۹۰
سورۂ حج				
۷۲	۵:۲۲	۱	علم کا خاتمہ	۸
۷۳	۳۲:۲۲	۳۹	تصویر	۷۵
۷۴	۳۶:۲۲	۳۹	تصویر	۷۵
۷۵	۵۵:۲۲	۲۴	بچوں کی پیدائش کا مسئلہ	۴۶
۷۶	۷۸:۲۲	۴۴	اسمِ اعظم اور نبوت	۸۳
سورۂ نُور				
۷۷	۳۵:۲۴	۱۲	نور” علیٰ نور	۲۸
۷۸	۳۵:۲۴	۱۲	نور” علیٰ نور	۲۹
۷۹	۳۵:۲۴	۲۵	حضرتِ عیسیٰ	۴۸
۸۰	۳۵:۲۴	۹۴	علی کا ایمان لانا	۱۸۰_۱۷۹
سورۂ قصص				
۸۱	۸۸:۲۸	۱	علم کا خاتمہ	۸
سورۂ عنکبوت				
۸۲	۵۷:۲۹	۲۸	حضرتِ خضر	۶۱

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

نمبر شمار	حوالۂ آیت	نمبر سوال	مضمون	صفحہ نمبر
۸۳	۶۴:۲۹	۲۱	بہشت اور دوزخ	۴۱
۸۴	۶۴:۲۹	۴۲	تبدّلِ اجسام	۸۰

سورۂ لقمان

۸۵	۲۰:۳۱	۸۵	کتبِ سماوی	۱۶۳
۸۶	۲۸:۳۱	۱۲	نورٌ علیٰ نور	۲۹
۸۷	۲۸:۳۱	۶۶	دنیا میں تکالیف کیوں	۱۲۱_۱۲۰

سورۂ سجدہ

۸۸	۲۴:۳۲	۹۹	قربانی	۱۹۱

سورۂ احزاب

۸۹	۲۱:۳۳	۴۴	اسمِ اعظم اور نبوت	۸۴
۹۰	۴۳:۳۳	۱۳	صلوات	۳۰
۹۱	۵۶:۳۳	۱۳	صلوات	۳۰

سورۂ فاطر

۹۲	۳۲:۳۵	۳۱	وارثِ رسول	۶۴

سورۂ یٰسٓ

۹۳	۱:۳۶	۶	سورۂ یاسین	۱۵
۹۴	۳۶:۳۶	۶	سورۂ یاسین	۱۸
۹۵	۳۶:۳۶	۴۲	تبدّلِ اجسام	۸۰
۹۶	۶۸:۳۶	۲	رجعتِ روح	۱۱
۹۷	۴۰:۳۶	۲	رجعتِ روح	۱۲
۹۸	۴۰:۳۶	۲۶	ظہوراتِ روح	۵۸

ISW
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

نمبر شمار	حوالہ آیت	نمبر سوال	مضمون	صفحہ نمبر
سورۂ صافات				
۹۹	۳۷:۹۹-۱۰۷	۹۹	قربانی	۱۹۱
۱۰۰	۳۷:۱۰۷	۹۹	قربانی	۱۹۱
سورۂ صٓ				
۱۰۱	۳۸:۳۲	۸۵	کتبِ سماوی	۱۶۱
سورۂ مؤمن				
۱۰۲	۴۰:۷	۷۹	فرشتے	۱۴۸-۱۴۹
سورۂ شوریٰ				
۱۰۳	۴۲:۱۳	۴۴	اسمِ اعظم اور نبوت	۸۳
۱۰۴	۴۲:۵۲	۱۶	نور کہاں سے آیا	۳۵
سورۂ زخرف				
۱۰۵	۴۳:۶۰	۷۹	فرشتے	۱۴۸
سورۂ جاثیہ				
۱۰۶	۴۵:۲۹	۹۱	تصورِ امامت	۱۷۵
سورۂ قٓ				
۱۰۷	۵۰:۳۵	۲۱	بہشت اور دوزخ	۴۰
سورۂ ذاریات				
۱۰۸	۵۱:۲۹	۲۴	بچوں کی پیدائش کا مسئلہ	۴۶
سورۂ واقعہ				
۱۰۹	۵۶:۴۹-۵۰	۶۶	دنیا میں تکالیف کیوں	۱۲۰

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

نمبر شمار	حوالۂ آیت	سوال نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
۱۱۰	۷۱:۵۶	۸۵	کتبِ سماوی	۱۶۱
سورۂ حدید				
۱۱۱	۲۸:۵۷	۹۱	تصورِ امامت	۱۷۵
سورۂ صف				
۱۱۲	۶:۶۱	۹۴	علی کا ایمان لانا	۱۷۹
۱۱۳	۸:۶۱	۳۱	وارثِ رسول	۶۵
۱۱۴	۸:۶۱	۳۲	امام اسماعیل	۶۷
۱۱۵	۸:۶۱	۴۲	تبدلِ اجسام	۷۹
سورۂ طلاق				
۱۱۶	۱۲:۶۵	۹۳	سات آسمان سات زمین	۱۷۷
سورۂ مُلک				
۱۱۷	۲:۶۷	۷	لاابتداء ولاانتہاء	۱۹
سورۂ قلم				
۱۱۸	۴:۶۸	۴۴	اسمِ اعظم اور نبوت	۸۴
سورۂ نُوح				
۱۱۹	۱۷:۷۱	۲۷	بنی آدم	۵۹
سورۂ مزمل				
۱۲۰	۲۰-۱:۷۳	۱۴	ذکر و بندگی	۳۱
سورۂ قیامۃ				
۱۲۱	۹:۷۵	۱۲	نورٌ علیٰ نور	۲۸

نمبر شمار	حوالۂ آیت	سوال نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
۱۲۲	۷۵:۱۴	۴۸	اختیار اور مقدر	۸۹
۱۲۳	۷۵:۲۳	۸۶	امام کا دیدار	۱۶۴
سورۂ بلد				
۱۲۴	۹۰:۱۰	۴۸	اختیار اور مقدر	۸۹
سورۂ شمس				
۱۲۵	91:9	--	سخنہائے گفتنی	۱۴۰
سورۂ عادیات				
۱۲۶	۱۰۰:۲	۸۵	کتبِ سماوی	۱۶۱
سورۂ اخلاص				
۱۲۷	۱۱۲:۱-۴	۳۸	توحید	۷۳

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

احادیثِ شریفہ

ISW
LS
Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

نمبر شمار	احادیث	سوال نمبر	صفحہ نمبر

حصۂ اول

۱	اگر مسلمان دس فیصد----	۳	۱۲_۱۳
۲	حدیثِ ثقلین--------	۳	۱۳
۳	یقیناً اسلام عجیب-----	۵	۱۵
۴	میری قبر اور میرے منبر---	۹	۲۲
۵	من مات فقد-------	۹	۳۹

حصۂ دوم

۶	تمام امتوں کے مومنین-----	۲۶	۵۸
۷	حسن اور حسین دونوں-----	۳۲	۶۷
۸	جس نے مجھ کو------	۳۹	۷۶
۹	علی کے چہرے-----	۳۹	۷۶
۱۰	قرآن کی طرف دیکھنا---	۳۹	۷۶
۱۱	حدیثِ قدسی (مفہوم)	۴۰	۷۶

حصۂ سوم

۱۲	بندوں پر توبہ کا دروازہ------	۵۶	۱۰۶
۱۳	نادِ علی (حدیثِ قدسی)	۵۸	۱۰۷_۱۰۸

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

نمبر شمار	احادیث	سوال نمبر	صفحہ نمبر
	حصّۂ چھارم		
۱۴	میں علی سے ہوں -----	۸۰	۱۵۳
۱۵	ان النبی صلی اللہ ----	۸۵	۱۶۱
۱۶	حدیثِ مرفوع ''النظر الٰی وجه---	۸۶	۱۶۴
۱۷	حدیثِ قدسی: اللہ تعالیٰ کو----	۸۷	۱۶۷
۱۸	مثل اھلِ بیتی مثلا سفینته---- میرے اہلِ بیت ----	۹۶	۱۸۳
۱۹	اے علی میں اور تم مومنین ومومنات	۹۸	۱۹۰

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

لغات و اصطلاحات

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

آ

آسٹرل باڈی .... ۳۶، ۳۷

آفاق وانفس .... ۲۴، ۱۳۸، ۱۷۰

آیاتِ رحمٰن ۱۴۰

ا

ابداع/ ابداعی .... ۸۱، ۱۶۸

اتمام حجت ۱۰۶

اڑن طشتری/خلائی کشتی .... ۳۶، ۳۷

UFOS / فلائنگ ساسرز

ازل وابد .... ۲۹، ۴۸، ۷۰، ۷۴، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۹۴، ۱۹۵

ازلی وابدی سلطنت ۴۰

اساس .... ۱۶، ۲۱، ۲۲، ۶۳، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۷۴، ۱۷۷، ۱۹۳

اسمِ اعظم /کارِ بزرگ .... ۷۲، ۷۵، ۸۲، ۸۵، ۹۱، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۴۴، ۱۵۹، ۱۷۱

الحی القیوم .... ۷۵، ۱۷۱

اُلوہیت ۱۷۰

امام/امامِ زمان/ائمۂ اطہار/ .... ۷، ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۸،
ائمۂ طاہرین/امامِ حاضر/ ۲۹، ۴۴، ۴۷، ۵۴، ۵۵، ۵۸، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵،
ائمۂ عظام/ائمۂ کرام/ ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۷۰، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۹، ۸۱،
امامِ عصر/امامِ وقت/ ۸۲، ۸۶، ۹۱، ۹۸، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۱۱،
ہادیٔ زمان/ہادی برحق ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۸، ۱۲۷،

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۱،
۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷،
۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵،
۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷،
۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵

امامت/ سلسلۂ امامت/ .... ۲۰، ۲۱، ۲۸، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۷، ۸۳، ۱۱۲، ۱۲۳،
مرتبۂ امامت/ نورِ امامت ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۶۸، ۱۷۰، ۱۷۲،
۱۷۳، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳

امام شناسی ۲۰
امامِ متم .... ۶۳، ۱۵۸، ۱۷۴
امامِ مستقر .... ۲۱، ۶۳، ۱۵۸، ۱۷۴، ۱۹۲
امامِ مستودع .... ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۶۳، ۱۵۸، ۱۶۷، ۱۷۴، ۱۹۲
امامِ مقیم .... ۶۳، ۸۳، ۱۵۸، ۱۷۴، ۱۸۰
امیر المومنین .... ۹۱، ۱۵۲
انا الحق .... ۱۱۳، ۱۱۴
انائے سفلی ۱۰۹
انائے علوی .... ۱۰۹، ۱۴۰
انسانِ کامل .... ۶۲، ۶۹، ۷۴، ۱۴۸، ۱۶۰، ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۹۵
اوصیاء ۱۴۹
اولی الامر .... ۱۳، ۱۴، ۱۵۰، ۱۷۵، ۱۸۳
اہلِ بیتِ اطہار/ پنجتن پاک ...... ۶۳، ۶۵، ۶۶، ۱۲۳، ۱۸۲، ۱۸۳
ایمانِ کامل .... ۱۰۴، ۱۱۷، ۱۲۹

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

ب

باب ۱۹۰
بارہ جزیرے ۱۳۰
باطنی قبر / روحانی قبر ۲۲
باطنی قیامت .... ۲۲، ۳۸
بقا .... ۹، ۱۹، ۴۶
بیعت ۱۰۷

پ

پیر .... ۱۰۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۷۱، ۱۸۹

ISW
LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

ت

تاویل/تاویلی حکمت .... ۱۶، ۲۲، ۳۰، ۳۳، ۴۰، ۶۱، ۶۲، ۸۲، ۱۲۲، ۱۲۳،
۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۵۸، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹،
۱۷۰، ۱۷۷، ۱۸۳، ۱۸۷، ۱۹۱
تصورِ امامت .... ۱۷۲، ۱۷۳
تصورِ خلافت ۱۷۲
تقیہ .... ۱۱۰، ۱۱۱
تنزیل .... ۶۲، ۱۴۵، ۱۹۱
توحید .... ۷۳، ۷۴، ۸۶، ۸۸، ۱۴۶، ۱۴۷

ج

جثۂ ابداعیہ .... ۴۴، ۱۶۸

جثۂ جسیم ۱۶۸

جسمِ فلکی ۴۴

جسمِ کثیف ۸۰

جسمِ لطیف .... ۳۶، ۳۷، ۸۰، ۱۶۸، ۱۶۹

چ

چہرۂ امام ۱۶۴

چہرۂ خدا ۱۶۵

ح

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

حادث ۳۴

حاملانِ عرش .... ۱۴۸، ۱۴۹

حبل اللہ ۶۵

حج ۷۵

حجّت/حجتوں .... ۴۳، ۴۴، ۱۲۸، ۱۶۸، ۱۷۸، ۱۹۰، ۱۹۳

حجتِ اعظم .... ۴۳، ۱۶۸

حجتِ جزیرہ ۱۶

حجتِ لیلی ونہاری ۱۳۰

حجتِ مقرب ۱۶

حدودِ جسمانی ۱۶

حدودِ دین .... ۴۴، ۴۵، ۷۴، ۱۹۳

حدیثِ ثقلین ۱۳

حدیثِ قدسی .... ۷۶، ۱۶۷

حروفِ مقطعات ۱۵

حق الیقین ۵۳

حقیقت .... ۹، ۵۷، ۶۳، ۷۴، ۸۶، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۵،
۱۴۰، ۱۴۷، ۱۶۷، ۱۹۴

حقیقتِ حقائق ۱۴۰

حقیقتِ واحدہ ۱۰۹

حقیقی علم / روحانی علم .... ۳۲، ۵۵، ۵۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۲

حکمت .... ۱۰، ۱۱، ۱۹، ۲۴، ۲۸، ۴۰، ۴۵، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۸،
۶۵، ۶۹، ۷۱، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۶، ۹۱، ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۵،
۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۳۸، ۱۳۹،
۱۵۱، ۱۵۳، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۷۳،
۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۸، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۳

حلال .... ۱۸۸، ۱۸۹

حواسِ باطن ۷۲

حواسِ ظاہر .... ۷۱، ۷۷

خ

خداشناسی .... ۷۳، ۷۴، ۱۰۲، ۱۲۴، ۱۴۰، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۶۶

خدائی روح/ خدائی نور .... ۱۴، ۷۹

خلافت الٰہیہ .... ۱۷۲، ۱۷۳

خلقِ عظیم ۸۴

خلیفۂ خدا .... ۱۷۳، ۱۷۴

خلیفۂ رسول ۱۷۳

خلیفۂ قائم ۳۸

خودشناسی .... ۷۳، ۸۷، ۱۴۰

خیرِ کثیر ۱۰

د

داعی/ داعیوں .... ۴۴، ۱۲۸، ۱۹۳

داعیٔ مطلق ۱۶

داعیٔ محفوف ۱۶

دائرۂ لاابتدا ۱۹

دائم الذکر ۷۱

دعوتِ حق .... ۱۰۶، ۱۸۲، ۱۸۳

دہر ۱۵۵

دیدارِ الٰہی/ دیدارِ خداوندی .... ۴۰، ۴۱، ۱۶۵، ۱۷۰

دیدارِ باطن .... ۱۶۵، ۱۷۰

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

دیدارِ ظاہر .... ۱۶۵، ۱۷۰
دینِ حق / دینِ اسلام.................. ۲۱، ۳۷، ۷۰، ۷۸، ۸۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۶،
۱۱۸، ۱۲۲، ۱۲۹، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۷۲، ۱۸۲، ۱۹۲
دین شناسی .... ۱۵، ۴۳، ۱۰۳، ۱۳۷
دینِ فطرت / قانونِ فطرت .... ۱۲، ۱۵، ۶۹، ۷۴، ۸۳، ۹۱، ۱۰۳، ۱۱۱، ۱۱۷، ۱۲۳،
۱۴۵، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶
دینِ واحد ۱۴۵

ڈ

Darvin Theory .... ۱۷، ۵۹

ذ

ذبحِ عظیم........................ ۱۹۲
ذرّاتِ نور / نورانی ذرات............ ۳۷، ۱۶۸
ذرّاتِ روح ۸۸
ذکرِ الٰہی ۸۴

ر

راہِ روحانیت ۳۲
رجعتِ روح ۱۰

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

روح اللہ .... ۳۵، ۴۷، ۷۹، ۱۶۵
روحِ امام .... ۲۸، ۲۹
روح شناسی .... ۱۰۲، ۱۲۴
روح القدس .... ۳۵، ۱۶۳
روحِ قرآن ۳۵
روحِ کلی ۱۲۱
روحِ کامل ۳۵
روحانی تائید ۱۳۸
روحانی سلطنت .... ۶۵، ۸۲
روحانی عورت ۱۲۳
روحانی مخلوق ۱۴۸
روحانی مرد ۱۲۳
روحانی قیامت ۲۲
روحانی ورق ۱۶۱

ز

زمان ومکان/ زمانۂ ناگزرندہ .... ۳۳، ۱۵۵

ش

شاہنشاہِ دین ۱۷۰
شریعت .... ۵۷، ۶۳، ۸۳، ۱۲۱، ۱۴۷، ۱۵۵، ۱۶۷،

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

شعائراللہ .... ۷۵، ۷۶

ص

صاحبِ امر .... ۴۲، ۱۷۴

صراط المستقیم/ راہِ مستقیم .... ۶۳، ۹۱، ۱۰۵، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۴۶، ۱۵۹، ۱۸۰

صورتِ رحمان ۱۶۵

ط

طریقت .... ۵۷، ۶۳، ۱۲۱، ۱۴۷

طوعاً وکرہاً ۱۲۰

طہارت ۱۴۰

ظ

ظاہر و باطن .... ۹، ۲۳، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۳، ۶۹،
۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۶، ۸۷، ۹۴، ۹۷، ۱۰۹،
۱۲۳، ۱۲۵، ۱۴۹، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۷،
۱۷۰، ۱۷۴، ۱۷۷، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۲، ۱۹۴، ۱۹۵

ظہوراتِ روح ۵۷

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

ع

عالمِ ارواح........................ ۱۰۹

عالمِ امر........................ ۱۱،۳۴،۳۵

عالمِ باطن........................ ۱۱،۹۱

عالمِ بالا/ عالمِ روحانی/ عالمِ علوی...... ۸،۱۱،۱۲،۳۴،۱۴۳،۱۵۴،۱۵۵،۱۷۰

عالمِ جسمانی........................ ۱۱،۱۲،۱۴۰،۱۷۰

عالمِ حقائق........................ ۱۰۹

عالمِ خلق........................ ۱۱،۳۴

عالمِ خواب........................ ۷۸،۱۵۴

عالمِ دین........................ ۲۶

عالمِ ظاہر........................ ۱۱

عالمِ عقول........................ ۱۰۹

عالمِ قدسی........................ ۱۲۳

عالمِ کثرت........................ ۱۰۹

عالمِ لامکان........................ ۱۳۹،۱۵۴

عالمِ مافوق الفطرت........................ ۱۷

عالمِ ملکوت........................ ۹۱

عالمِ نفسی........................ ۱۷۰

عالمِ وحدت........................ ۱۰۹،۱۱۰

عالمگیر روح........................ ۳۶،۴۸،۸۰،۱۵۴

عظیم سلطنت/ ملکاً عظیم........................ ۶۵،۸۳

علم الیقین........................ ۶۸،۸۷،۱۱۰

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

علمِ توحید ۷۳

علمِ قیامت ۳۸

عین الیقین .... ۹، ۵۳

ف

فرشتۂ رحمت ۷

فنا .... ۹، ۱۹

ق

قانونِ اسلام ۱۸۹

قانونِ الٰہی .... ۴۴، ۱۴۵

قانونِ امامت ۱۸۶

قانونِ قدرت .... ۱۵، ۳۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۴، ۱۸۴،

قانونِ نبوت ۱۸۶

قائم القیامت/حضرتِ قائم .... ۲۲، ۲۶، ۳۸

قدیم .... ۳۴، ۳۵، ۶۹

قرآنی حکمت ۱۸

قربِ الٰہی ۱۹۳

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

ک

کامل روح ۱۲

کتابِ روح ۱۴۰

کتابِ ذات ۱۴۰

کتابِ سماوی/کتبِ سماوی .... ۱۳۹،۱۴۰،۱۶۰

کتابِ صامت/قرآنِ صامت ..... ۸۱،۸۲،۸۵،۸۶،۱۵۵

کتابِ کائنات ۱۴۰

کتابِ مبین .... ۱۱۲،۱۱۳

کتابِ ناطق/قرآنِ ناطق .... ۸۱،۸۲،۸۵،۸۶،۱۵۵،۱۷۵،

کتابِ نفسی ۱۴۰

کثیف ۴۱

کشفِ باطن ۱۴۳

کلماتِ تامّات ۱۶۱

کمالِ معرفت ۱۱۳

کُنّ (کلمہ) ۲۶

کن فیکون ۱۶۸

گ

گریہ وزاری ۷۱

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

ل

لامکان .... ۱۵۳،۱۵۴،۱۵۵،۱۶۶

لسان اللہ ۱۶۳

لطیف .... ۴۱،۱۰۰

م

ماذونِ اصغر ۱۶

ماذونِ اکبر ۱۶

مرتبۂ نبوت .... ۱۲۲،۱۷۸

مرتبۂ ولایت ۱۵۱

مستجیب ۱۶

مظہر العجائب ۱۰۷

مظہرِ نورِ الٰہی/مظہرِ نورِ خدا........... ۲۴،۱۶۵،۱۹۴

معرفت .... ۱۰،۲۶،۲۷،۳۲،۳۹،۴۲،۵۷،۶۱،۶۳،۷۴،
۷۶،۷۷،۹۱،۱۰۲،۱۰۳،۱۱۳،۱۱۴،۱۲۱،۱۲۲،
۱۲۳،۱۲۴،۱۲۵،۱۳۹،۱۴۷،۱۴۸،۱۴۹،۱۵۹،
۱۶۰،۱۶۲،۱۶۶،۱۸۰،۱۹۳

معلمِ قرآن .... ۱۳،۸۲،۱۰۵

منزلِ فنا ۹۷

منزلِ مقصود .... ۱۰۳،۱۳۷

منزلِ نجات ۱۱۵

ن

ناطق .... ۱۶، ۲۱، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۸، ۱۷۷، ۱۹۳

نزولِ وحی ۱۲۳

نفسِ امّارہ ۴۴

نفسِ خلائق ۱۲۰

نفسِ کلّی .... ۸۰، ۱۲۱، ۱۵۴

نفسِ واحدہ .... ۲۱، ۱۴۵، ۱۵۱

نماز ۱۸۷

نوراللہ ۶۵

نورِالٰہی/نورِخداوندی .... ۹، ۲۴، ۱۱۰، ۱۶۶

نورٌ علیٰ نور .... ۲۸، ۲۹، ۱۷۹، ۱۸۰

نورِکامل ۸۶

نورِکُل ۸۶

نورِمحمدی ۵۸

نورِمطلق ۸۵

نورِمعرفت ۱۸۰

نورِمقدس ۱۷۴

نورِواحد .... ۸۵، ۸۶، ۱۱۱، ۱۱۲

نورِہدایت .... ۱۴، ۹۸، ۹۹، ۱۷۵، ۱۸۴

نورِیزدان ۳۵

نورانی مخلوق ۱۴۸

نورانی ہدایت .... ۱۱۱، ۱۳۹

و

وجودوبقا ۵۸
وجودوعدم .... ۱۷، ۱۸، ۱۹
وحدت ۱۰۹
ولایت .... ۱۰۸، ۱۲۶، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۳، ۱۷۰
ولیِ امر .... ۱۴، ۶۵، ۸۲، ۹۱، ۱۴۹، ۱۵۱

ہ

ہستی ونیستی .... ۱۷، ۱۸، ۱۹

ی

یک حقیقت .... ۱۰، ۷۳، ۷۴، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۱۰۹
یومِ عقیم ۴۶

(انڈیکس کی کاوش صائمہ شوکت علی اور سائرہ شوکت علی نے کی)

www.monoreality.org

ISBN 1-903440-06-8

9 781903 440063